

ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ
وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ



مَقَالِ الشَّيْخِ الْإِسْلَامِ

شَيْخِ الْإِسْلَامِ وَالْمُسْلِمِينَ

حَفَظَتْ عَلَامَةُ مُحَمَّدٍ نَبِيِّ شَيْخِي جِيالِي

عَلَامَةُ حَقِّ كِي سِرِ پَرِ حَقِّ مِیں رُواں دُواں



اَلْمُسْلِمَتِ وَجَمَاعَتِ كَاكِبِ چمكنا روشن ستاره

گلوبل اسلامک مشن انک

نیویارک، یو ایس اے



باجازت مصنف
'جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ'

- نام کتاب: 'مقالات شیخ الاسلام'
مصنف: شیخ الاسلام حضرت علامہ سید محمد مدنی اشرفی جیلانی مدظلہ عالی
خارجہ مقالات: شیخ الحدیث حضرت علامہ غلام جیلانی اشرفی
عرض ناشر: محمد مسعود احمد سہروردی، اشرفی
کمپیوٹر کتابت: منصور احمد اشرفی
اشاعت اول: رجب المرجب ۱۴۲۵ھ بمطابق اگست ۲۰۰۴ء
اشاعت دوم: ۲۰ ربیع الاول ۱۴۲۹ھ بمطابق ۲۸ مارچ ۲۰۰۸ء
تعداد: ۱۰۰۰
ناشر: گلوبل اسلامک مشن، انک
نیویارک، یو ایس اے

Published By:



Global Islamic Mission, INC.
P.O. Box 100
Wingdale, NY 12594
U.S.A.
www.globalislamicmission.com

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
 اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ
 وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ
 عَلَى إِبْرَاهِيمَ وَعَلَى آلِ إِبْرَاهِيمَ
 إِنَّكَ حَمِيدٌ مُجِيدٌ
 اللَّهُمَّ بَارِكْ عَلَى مُحَمَّدٍ وَعَلَى
 آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلَى
 إِبْرَاهِيمَ وَعَلَى آلِ إِبْرَاهِيمَ
 إِنَّكَ حَمِيدٌ مُجِيدٌ



عرض ناشر

شیخ الاسلام والمسلمین، حضرت علامہ سید محمد مدنی اشرفی جیلانی، مدظلہ العالی کا شمار عالم اسلام کے جید علماء کرام کی صف میں ہوتا ہے، کہ جنگی انتھک کاوشوں کے نتیجہ میں لاکھوں فرزندانِ توحید، مسلکِ حق سے نہ صرف وابستہ ہیں بلکہ سختی سے کار بند ہو کر ایمان اور کمالِ ایمان کے سارے تقاضے پورے کرتے ہوئے، رب تعالیٰ اور اسکے پیارے حبیب ﷺ کو راضی کرنے میں کوشاں ہیں۔۔۔ آج کے دور کی یہ نمایاں خصوصیت ہے کہ جس زمین پر، بلکہ زمین میں جس جگہ بھی، چاہے وہ مسجد ہو یا مدرسہ یا کوئی اور دینی ادارہ ہی ہو، جس کا قبضہ ہے اسی کا قانون، اسی کا حکم اور اسی کا عقیدہ چلتا ہے چاہے اس کا تعلق حق سے دور کا بھی نہ ہو۔ جیسے کہاوت ہے 'جسکی لاشی اسکی بھینس'۔ ایسے میں 'حق' کی شمع بلند رکھنا یہ بڑے ہی اولوالعزم نفوس کا کام ہے۔

آج جبکہ اسلاف کی صحیح نمائندگی کرنے والے علمائے حق کی تعداد میں تیزی سے کمی واقع ہو رہی ہے، اور جو بزرگ ہستیاں اس دنیا سے کوچ فرما رہی ہیں ان کا نعم البدل ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل پارہا ہے۔ ایسے میں ہم دل کی گہرائیوں سے اللہ رب العزت کے حضور دعا گو ہیں کہ پروردگار عالم حضور شیخ الاسلام سمیت موجودہ دور کے علمائے حق یعنی علمائے اہلسنت وجماعت کی عمروں میں برکت عطا فرمائے اور ان سب کو اپنے اپنے اہل خانہ اور مریدین و معتقدین پر عرصہء دراز تک قائم و دائم فرمائے۔ ﴿آمین﴾

ہمارے ادنیٰ خیال میں ہمیں چاہئے کہ جن جن بزرگانِ دین، پیرانِ عظام اور اساتذہ کرام سے ہم کسی نہ کسی صورت میں وابستہ ہیں، ان سے عقیدت و محبت

کے ساتھ ساتھ ان کے کام کو یعنی ان کے مشن کو بھی آگے بڑھائیں تاکہ مسلک حقہ کی روشنی دور دور تک پھیلے اور اسکو مٹانے والے عناصر کی کوششیں کبھی بھی بار آور نہ ہو سکیں۔ انہی خیالات کی روشنی میں آج سے تقریباً ۱۰ برس پہلے ہم نے امریکہ میں گلوبل اسلامک مشن کی بنیاد رکھی جس کا مقصد علمائے حق، یعنی علمائے اہلسنت وجماعت کا تحریری و تقریری پیغام مسلمانوں میں اور بالخصوص اسلام کا پیغام حق غیر مسلموں میں عام کرنا تھا۔ یہ بزرگوں کی نظر کرم اور توجہ ہی کا نتیجہ ہے کہ اللہ رب العزت نے ہم پر کرم فرما کر دین متین اور مسلک حقہ کی خدمت کرنے کا عظیم موقع عطا فرمایا۔

اس سے پہلے اردو ترجمہ قرآن موسوم بہ 'معارف القرآن' جس کے مترجم محدث اعظم ہند، حضور سید محمد محدث کچھوچھوی علیہ الرحمۃ ہیں، اور انہی کی تفسیر، سید التفاسیر المعروف بہ 'تفسیر اشرفی' (پہلا پارہ)، مسئلہ قیام و سلام اور محفل میلاد، اور حضور شیخ الاسلام حضرت علامہ سید محمد مدنی اشرفی جیلانی مدظلہ عالی کی کتابیں، 'محبت رسول روح ایمان'، 'فریضہ دعوت و تبلیغ'، 'دین کامل'، 'حدیث نیت اور حدیث جبرائیل کی شرحیں'، 'نظریہ ختم نبوت اور تحذیر الناس'، 'چالیس احادیث کی شرح'، 'الاربعین الاشرافی' اور

اسکے علاوہ The Soul of Islam, Decisive Decision, Essentials of Islam, اور انگلش میں کئی اور کتابوں کی اشاعت کا شرف اس ادارے کو حاصل ہو چکا ہے۔ جس کیلئے ہم رب تبارک و تعالیٰ کے بے حد شکر گزار ہیں کہ وہ ہمارے ہی فائدے کیلئے ہمیں ایسے اعمال انجام دینے کی توفیق مرحمت فرما دیتا ہے جو ہمارے لئے آخرت کے سفر کا توشہ بن جاتے ہیں۔ ہم دعا گو ہیں کہ اللہ رب العزت، ہمیں دین اسلام اور مسلک حقہ کی مزید خدمت کرنے کے مواقع عطا فرمائے۔ ﴿آمین﴾

زیر نظر کتاب، بنام 'مقالات شیخ الاسلام' (دوسرا ایڈیشن) ہمارے ادارے کی شائع کردہ کتابوں کی فہرست میں ایک حسین اضافہ ہے۔ 'مقالات شیخ الاسلام' کا

تذیلی تعارف آگے کے مضمون میں، جو جید عالم دین، شیخ الحدیث، حضرت علامہ غلام جیلانی اشرفی صاحب (کراچی، پاکستان) نے قلمبند کیا ہے، موجود ہے۔ اور پھر مقالات خود ہی اپنی اہمیت اور شیخ الاسلام کے قلم کی شان بیان کر دیں گے۔ یہاں ہم صرف ہلکا سا تعارف تحریر کرنا چاہتے ہیں تاکہ قارئین کی معلومات میں مزید اضافہ ہو سکے۔ یہ مقالات ۳۰ سے ۳۵ سال قبل تحریر فرمائے گئے تھے جو وقتاً فوقتاً انڈیا کے ماہناموں میں کامل طور پر اور قسطوار بھی چھپتے رہے۔۔۔ مختلف سالکین کے سوالات کے جوابات کے طور پر اور وقت کی ضرورت کے پیش نظر یہ مقالات قلمبند کئے گئے تھے۔۔۔ ہو سکتا ہے آج کا کوئی ساکلی یہ سوال کر بیٹھے کہ آج کا دور تیس سے پینتیس سال پرانے دور سے بہت تیزی سے آگے بڑھ گیا ہے، لہذا اُس دور میں کئے گئے سوالات اور دیئے گئے جوابات کا آج کے دور سے کیا تعلق ہے جو مقالات چھاپنے کی زحمت اٹھائی جا رہی ہے؟۔۔۔

تو ہم اس کا جواب یہ دیں گے کہ یہ بجا ہے کہ آج کا دور اپنے سے پہلے کے دور سے بڑی ہی تیزی سے بہت آگے نکل آیا ہے، مگر جب ہم مذہب اسلام کے تعلق سے ان ذہنوں کا جائزہ لینگے جو بڑی ہی تیزی سے دنیا کی بظاہر ترقی میں اپنے کو بہا کر آگے کی جانب بڑی دور لے گئے ہیں، تو پتہ چلے گا کہ غیر مسلموں کی بات تو علیحدہ ہے، بہت سے مسلمان بھی یہی سوالات کرتے ہوئے نظر آئیں گے جن کے جوابات شروع کے دو مقالات میں مفصل دے دیئے گئے ہیں۔

رہ گئی یہ بات کہ چھپوانے کی زحمت کیوں اٹھائی جا رہی ہے۔۔۔ تو وہ اسلئے کہ یہ بات ہمارے لئے بڑی ہی باعث سعادت ہے کہ دورِ حاضر کے شیخ الاسلام حضرت سید محمد مدنی اشرفی جیلانی (امت برکاتہم العالیہ) کی وہ تحریریں ہمیں شائع کرنے کا موقع مل رہا ہے جن میں تفصیل سے اسلام کی حقانیت، آج کے دور میں اسلامی قوانین کی پہلے

سے کہیں زیادہ ضرورت، تمام ادیان میں اسلام کی برتری، اور رسول اکرم ﷺ کے تشریعی اختیارات کو قرآن و سنت اور عقلی و نقلی دلائل سے کامل طور پر ثابت کیا گیا ہے اور سیر حاصل گفتگو فرمائی گئی ہے۔ جوان باتوں کے خلاف عقیدہ رکھتے ہیں، وہ چاہے مدعیان اسلام میں سے ہوں، اسلام کے وفادار نہیں۔ حضرت نے صاف ظاہر فرمادیا ہے کہ طلب دنیا کے دریا میں تیزی سے بہنے والے وہ افراد جو دین اسلام کو اپنی مرضی اور آسانی کیلئے ایک نئے اور غلط رنگ میں ڈھالنا چاہتے ہیں، وہ اسلام کے دوست نہیں بلکہ درپردہ اسلام کے دشمن ہیں جنکا مقابلہ جانشین رسول ﷺ یعنی علمائے حق، یعنی علمائے اہلسنت و جماعت ہمیشہ سے کرتے آئے ہیں اور ہمیشہ کرتے رہیں گے۔

ہمیں چاہئے کہ ان مقالات کا گہری نظر سے مطالعہ کریں اور خود بھی حق و باطل کا فیصلہ کریں۔ دوستو! ایمان کو اس دنیا سے بچا کر لیجانے والا ہی سب سے بڑا کامیاب ہے اور اس دور میں جبکہ ایمان کے دشمن جگہ جگہ موجود ہیں، ہمیں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم دین کا علم، صحیح علمائے کرام اور صحیح کتابوں سے حاصل کریں۔ گلوبل اسلامک مشن بھی اسی مشن میں کوشاں ہے کہ اسلام کا صحیح علم عامۃ المسلمین تک پہنچائے اور عامۃ الناس پر اسلام کی حقانیت کو روشناس کرائے۔ اس مشن کی کامیابی کیلئے ہم آپ سے بھی دعاؤں کی درخواست کرتے ہیں۔

مقالات پر مشتمل اس مجموعہ کو یعنی حضرت کے قلم مبارک سے نکلے ہوئے علم دین کے ان موتیوں کو، جن کو شائع کرنے کی اجازت ہمیں حضور شیخ الاسلام نے عطا فرمائی ہے، اس کیلئے ہم انکے بے حد شکر گزار ہیں کہ تھوڑی سی محنت کر کے ہم دین اسلام کے ادنیٰ خادموں میں اپنا نام لکھانے کی سعیء مبارک کر لیتے ہیں۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ شیخ الاسلام حضرت سید محمد مدنی میاں صاحب کی عمر اور صحت میں برکت عطا فرمائے اور آپ کا علمی و روحانی فیض تادیر جاری و ساری فرمائے۔ ﴿ آمین ﴾

ہماری کوئی عرض اور کوشش اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ ہم ان بزرگانِ دین اور علمائے کرام و احبابِ حلقہ کا شکریہ ادا نہ کر دیں جنہوں نے ان خدمات کو انجام دینے میں کسی نہ کسی طرح ہماری رہنمائی و مدد فرمائی ہے۔

ہم عالمی مبلغِ اسلام، قائدِ اہلسنت حضرت علامہ مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی رحمۃ اللہ علیہ کو، خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں کہ آپ ہمیشہ ہمیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھا کرتے تھے اور مفید مشوروں سے نوازا کرتے تھے۔ رب تبارک و تعالیٰ انکے درجات بلند سے بلند تر فرمائے اور حضرت کارو حانی فیض جاری و ساری رہے۔۔۔ مسعود ملت، حضرت پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد صاحب دامت برکاتہم العالیہ جن کے عوام و خواص اہلسنت پر بیش بہا احسانات ہیں اور جو ہر قدم پر ہماری رہنمائی فرماتے ہیں۔ ہم ان کے بھی بے حد شکر گزار ہیں اور دعا گو ہیں کہ رب ذوالجلال آپ کی عمر و صحت میں برکت عطا فرمائے۔۔۔۔۔ خیر الاتقیاء، شیخ الحدیث حضرت علامہ مفتی نصر اللہ خان صاحب افغانی مدظلہ جو عرصہ دراز سے دین اسلام اور مسلکِ حقہ کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں، ہم پر بڑی کرم نوازی فرماتے ہیں اور دعاؤں سے نوازتے ہیں، ہم انکے بھی بے حد مشکور ہیں۔۔۔۔۔ نمونہٴ اسلاف، خوبصورت و خوب سیرت، حضرت علامہ مفتی محمد اطہر نعیمی صاحب مدظلہ جنکے پاس بیٹھ کر اٹھنے کو دل نہیں چاہتا، ہمارے لئے کام کرنے کی نئی امتگیں پیدا فرماتے ہیں اور مفید مشوروں سے نوازتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی عمر و صحت میں برکتیں عطا فرمائے۔ ﴿ آمین ﴾

جامعہ نضرۃ العلوم کے جناب حضرت علامہ مفتی الیاس رضوی صاحب، جناب حضرت علامہ غلام جیلانی اشرفی صاحب (شیخ الحدیث) جناب علامہ رضوان احمد صاحب، جناب سید ریاض علی اشرفی صاحب، جو صوتِ الشرق پبلک اسکول، شاہ فیصل کالونی، کراچی، پاکستان کے مہتمم بھی ہیں، اور تمامی احباب کی ہر دل عزیز شخصیت،

علامہ رجب علی نعیمی صاحب بھی جملہ علماء کرام کے ساتھ ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں جو قدم قدم پر ہماری رہنمائی اور تصحیح فرماتے ہیں۔ خاص طور پر ہم شکر گزار ہیں جناب علامہ غلام جیلانی اشرفی صاحب (شیخ الحدیث) کے، کہ جنہوں نے ایک خوبصورت مضمون 'تعارف مقالات' کے نام سے ہمیں اس کتاب کیلئے لکھ کر عنایت فرمایا۔ ہمیشہ کی طرح ہم جناب محمد فخر الدین علوی صاحب کے بھی شکر گزار ہیں جو وقتاً فوقتاً ہمیں اپنی تحریروں سے نوازتے رہتے ہیں۔ گلوبل اسلامک مشن کی پوری ٹیم، اور خاص طور پر منصور احمد اشرفی جنہوں نے اس پوری کتاب کی کمپیوٹر کتابت سرانجام دی ہے کے شکر گزار ہیں جنہوں نے مختلف مراحل میں ہماری مدد فرما کر اس ادارے کو متمتعہ امتیاز کے قابل بنایا۔ چھپائی کے تعلق سے مسرور علی اور سلیم الدین صاحب بھی شکریہ کے مستحق ہیں۔

آخر میں ہم دعا گو ہیں کہ اللہ رب العزت اپنے حبیب ﷺ کے وسیلہء جلیلہ کے طفیل ہماری اس ادنیٰ کوشش کو شرف قبولیت بخشے ہوئے اسکو ہم سب کیلئے آخرت کا توشہ بنادے اور ہم سب کو بزرگان اہلسنت سے وابستہ رہتے ہوئے دین اسلام اور مسلک حق کی خدمت کرنے کے مزید مواقع مرحمت فرمائے۔

امین بجاہ النبی الکریم والہ واصحابہ اجمعین

ابوالمنصور روالپنڈو

محمد مسعود احمد

سہروردی، اشرفی

چیئرمین

گلوبل اسلامک مشن، ایک

نیویارک، یو ایس اے



تعارفِ مقالات

قرآن وحدیث، جسے دانشوران امت کتاب وسنت سے تعبیر کرتے ہیں، اسلام کی مبدع تاریخ سے آج تک اور اب سے صبح قیامت تک، جب تک اس دھرتی پر مسلمان موجود ہیں، اُن کے جملہ مسائل کا حل، خواہ دینی ہو یا دنیاوی، انفرادی ہو یا اجتماعی، ملکی ہو یا بین الاقوامی، اسی کتاب وسنت میں موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ ﷻ نے اس کتاب مقدس کا تعارف خود اس طرح فرمایا ہے۔

--- وَلَا رَظِي وَلَا يَاسِي ۚ اَلَا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ ﴿۵۹﴾

اور نہ تر، اور نہ خشک، مگر سب ایک روشن کتاب میں ہے۔

--- اور ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

--- وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ---

﴿سورۃ النحل: ۸۹﴾

اور ہم نے اتارا ہے تم پر کتاب روشن بیان ہر چیز کا۔

--- اس سلسلہء عنوان میں مزید قرآنی آیات پیش کی جاسکتی ہیں۔ جہاں تک سنت کا تعلق ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسی اپنی کتاب ہدایت میں سنت کی حیثیت و اہمیت کو واضح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

--- وَمَا اَنذَرُكُمْ الرِّسُولُ فَخُذُوهُ ۚ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا ---

﴿سورۃ النحل: ۶۷﴾

اور جو کچھ دے دیا تم کو رسول نے تو لے لو اسے، اور جس سے روک دیا تمہیں تو روک جاؤ

مذکورہ بالا آیت میں اللہ ﷻ نے رسول اللہ ﷺ کی اس امت کو یہ پیغام دیا ہے کہ دربار رسالت مآب ﷺ سے تمہیں جو کچھ دیا جائے وہ لے لو۔ جس کام کے

کرنے کا حکم دیا جائے وہ کرو۔ جس سے منع کیا گیا اس سے رک جاؤ۔ اسی میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی کامل و اکمل رضا ہے۔ اس آیت مبارکہ سے رسول اللہ ﷺ کی وہ سنتیں جو احادیث مبارکہ میں موجود ہیں، ان کی شرعی حیثیت کا بھرپور تعین ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مستند مفسرین قرآن نے اس آیت کے تحت یہ وضاحت کی ہے کہ یہ آیت مبارکہ اگرچہ مالِ فنی سے متعلق ہے مگر یہ حکم عام ہے کہ حضور ﷺ جو حکم دیں، چاہے اس کا تعلق اعتقاد سے ہو یا عمل سے، عبادات سے ہو یا معاملات سے، مالی ہو یا غیر مالی، سب کو شامل ہے۔

--- اس اصول کی تائید میں معروف تفسیریں درج ذیل ہیں:

☆ ۱- تفسیر بیضاوی ☆ ۲- تفسیر خازن ☆ ۳- تفسیر مدارک

☆ ۴- تفسیر روح البیان ☆ ۵- تفسیر درمنثور

☆ ۶- تفسیر جلالین ☆ ۷- تفسیرات احمدیہ

--- اسکے علاوہ دیگر حوالہ جات کیلئے بھی مذکورہ آیت کے تحت ان تفاسیر کو ملاحظہ کیجئے:

عملاً امت مسلمہ کے اصحاب علم و فضل کی تاریخ پر ایک طائرِ انظار ڈالی جائے تو ازمزہ صحابہ سے آج تک اس امت میں ہمیشہ ہر دور میں ایسے اصحاب علم و فضل موجود رہے ہیں جنہیں اللہ تبارک و تعالیٰ نے بھرپور علمی و فکری صلاحیتیں و دبیت فرمائیں اور انہوں نے دنیا کے سامنے پیش آنے والے ہر مشکل سے مشکل تر مسئلے کا حل و دلائل براہین، بھرپور فکر و نظر، اور کامل و اکمل روایتوں و درایتوں کے ساتھ پیش کیا۔ ان اصحاب علم و دانش میں خلفاء راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے علاوہ دیگر معروف صحابہ کرام بھی ہیں۔۔۔ مثلاً: حضرت عبداللہ ابن مسعود، حضرت عبداللہ ابن عمر، حضرت عبداللہ ابن عباس و دیگر متعدد صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔ ایسے ہی تابعین و تبع تابعین میں بہت ہی نمایاں نام امام اعظم ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ، امام مالک اور ان کے تابعین،

امام شافعی اور ان کے اصحاب، امام احمد بن حنبل و دیگر محدثین۔ یہ قافلہ علم و فضل یونہی رواں دواں رہا اور زمانہء جبر و ملوکیت میں بھی حق کا نعرہ بلند کرتا رہا۔ اسلامی جغرافیائی سرحدیں وسیع ہوتی رہیں اور اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے فضل سے اس اُمت میں صاحبان دانش و بینش کو پیدا فرماتا رہا، یہاں تک کہ آج کا دور۔

آج کے دور کے حوالے سے کہنے کو تو بہت کچھ ہے مگر ایک چیز بہت نمایاں ہے جس کو ہر شخص محسوس کر رہا ہے۔ اور وہ ہے 'خیر و شر' کے مابین بھرپور لکراؤ۔ یہ خیر و شر کی جنگ یوں تو ہر انسانی معاشرہ میں ہے، لیکن شوخی قسمت مسلم معاشرے میں بہت عروج پر ہے۔ آج کی دنیا میں لکھنے پڑھنے کی تمام تر سہولتیں موجود ہیں، سمجھنے سمجھانے کے تمام تر ذرائع و وسائل موجود ہیں، اور یہ ذرائع اور وسائل 'خیر و شر' میں تہر ایک کیلئے تبلیغ کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔ آج کا دور میڈیا کا دور ہے۔ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرونک میڈیا کی بھرمار ہے۔ معمولی فہم رکھنے والا انسان بھی بخوبی سمجھتا ہے کہ پرنٹ میڈیا کے مقابلے میں الیکٹرونک میڈیا انتہائی مؤثر ہے۔ اے کاش! کہ مسلم ممالک میں الیکٹرونک میڈیا کے ذریعے اسلام کا حقیقی پیغام پہنچتا، صحابہ و تابعین علیہم السلام کا چرچا ہوتا، ائمہ و مجتہدین کے علمی و فکری مواد کا مؤثر بیان ہوتا، امانت و بزرگان دین کا محبتوں بھرا پیغام پہنچایا جاتا۔۔۔ لیکن یہ سب کچھ ہنوز خواب ہے۔ شاید کبھی مستقبل میں اس کی تعبیر ممکن ہو سکے۔

آج کی دنیا میں علمی و فکری تحریریں، جو تحقیق و تدقیق پر مبنی ہیں، ضخیم مجلدات کی شکل میں اور مختصر کتابچوں اور مؤثر ملفوظات و مقالات کی صورت میں دستیاب ہیں اور ذوق و شوق رکھنے والے طلباء اور علماء اس سے استفادہ کر رہے ہیں۔ آج دنیائے اہلسنت میں علمائے جدید و قدیم کی تحریریں ضخیم مجلدات اور مختصر کتابچوں کی صورت میں موجود ہونے کے باوجود عوام اہلسنت میں وہ طبقہ جو مطالعہ کا ذوق و شوق رکھتا ہے انکا

یہ مطالبہ ہے کہ علماء و دانشورانِ اہلسنت جدید دور کے تقاضوں کے مطابق جدید موضوعات پر مثلاً۔۔۔ سیاست جدید، عمرانیات، اقتصادیات و معاشیات پر اسلام کا نقطہ نظر قرآن و سنت کی روشنی میں پیش کریں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کے فضل و کرم سے اہلسنت میں ایسے اصحاب علم و فضل ہیں جو ان موضوعات پر محققانہ بحث کر سکتے ہیں۔ بس ضرورت ہے توجہ کی۔۔۔

مختلف موضوعات پر بھرپور علمی و فکری مقالات پیش کرنے والے نامور علمائے کرام ماضی قریب میں اور اب بھی موجود ہیں جنکے مقالات اور تحریروں نے اہل علم و دانش پر اپنا اثر قائم کیا۔۔۔ مثلاً: مقالات علامہ کاظمی رحمہ اللہ، مقالات پیر کرم شاہ الازہری رحمہ اللہ، مقالات علامہ سعیدی دامت برکاتہم العالیہ اور دیگر علماء و فضلاء کے مقالات۔

سردست پیش نظر شیخ الاسلام حضرت علامہ سید محمد مدنی اشرفی جیلانی کچھوچھو مدظلہ العالی کے مختلف موضوعات پر مقالات ہیں۔ ان مقالات کو کتابی شکل میں چھپوانے کا اہتمام محترم و مکرم جناب محمد مسعود احمد صاحب کر رہے ہیں جو گلوبل اسلامک مشن، ایک (نیو یارک، یو ایس اے) کے بانی و سرپرست ہیں۔ جناب محمد مسعود احمد صاحب کے رفیق کار اور میرے نہایت واجب الاحترام دوست، سید ریاض علی اشرفی صاحب نے مجھے حکم دیا کہ میں قبلہ مدنی میاں مدظلہ العالی کے ان مقالات پر کچھ تحریر کروں۔ گو میں نے اپنی کم علمی و کم فہمی کی بنیاد پر اور خاص طور پر لکھنے کی صلاحیت بالکل نہ ہونے کی وجہ سے ان سے معذرت کی مگر ان کا اصرار تھا کہ میں کچھ نہ کچھ تحریر کروں۔ سو چند ٹوٹے پھوٹے لفظوں پر مشتمل یہ تحریر بنام 'تعارف مقالات' پیش خدمت ہے۔

حضرت شیخ الاسلام کے یہ مقالات درج ذیل عنوانات کے تحت ہیں:

﴿۱﴾۔۔۔ اشتراکی سوالات کے اسلامی جوابات۔

﴿۲﴾۔۔۔ تین سوالوں کا جواب۔

۳۔۔۔ تحریم اور فلسفہء تحریم۔

۴۔۔۔ شرح و حواشی فی التحقیق الباری فی حقوق الشارع۔

یہ مختصر رسالہ رسول اکرم ﷺ کے تشریفی اختیارات کے نام سے قبلہ مدنی میاں صاحب کے والد ماجد حضور محدث کچھوچھوی رحمہ اللہ کی تحریر ہے۔ اسکی شرح اور حاشیہ جناب مدنی میاں کی تحقیق ہے۔

اسکے علاوہ اور دیگر مقالات بھی ممکنہ طور پر اس مجموعے میں شامل کئے جاسکتے ہیں جو ابھی جمع و تدوین کے مراحل میں ہیں۔

مذکورہ بالا موضوعات میں کوئی بھی موضوع ایسا نہیں ہے کہ جس پر مختلف علماء کرام، فضلاء عظام اور دانشوران امت نے اظہار خیال نہ کیا ہو۔ لیکن یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ ہر محقق کی تحقیق میں، ہر محرر کی تحریر میں، ہر مستدل کے استدلال میں، ہر مستخرج کے استخراج میں، بلکہ ہر مجتہد کے اجتہاد میں اسکی علمی و فکری صلاحیتوں اور جودتِ طبع کا امکانی حد تک دخل ہوتا ہے۔ اور ہر ایک کی تحریر کا اپنا ایک رنگ ہوتا ہے جب ہی تو غالب نے کہا تھا:۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے

کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

چنانچہ جناب غالب کی زبان میں کہا جاسکتا ہے کہ حضرت مدنی میاں کا انداز ان تحریروں میں جداگانہ، منفرد، علمی، فکری اور بہت عمدہ ہے۔ ہر وہ صاحب علم جو تحریر کی دنیا میں قدم رکھے اور طبع آزمائی کرے اور اپنی تحریری کاوشیں دنیا کے سامنے پیش کرے وہ ہمیشہ زندہ و تابندہ رہتا ہے۔ کسی عربی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔۔

یلوح الخط فی القراطس دھرا وکاتبہ ریم فی التراب

صفحہ قراطس پر تحریر ہمیشہ چمکتی دکتی رہے گی اور لکھنے والا ہمیشہ کیلئے آمودۂ خاک ہو جائے گا۔

--- ﴿ پہلا مقالہ --- ’ اشتراکی سوالات کے اسلامی جوابات ﴾ ---

فلسفہ اشتراکیت -- یہ فلسفہ مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ اشتراکیت، سوشلزم، کمیونزم، مارکس ازم اور غالباً دہریت۔ روئے زمین پر انسانوں کو ہمیشہ مسائل و مصائب اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور ہر مشکل کے حل کیلئے انسانوں کے سماج میں کچھ لوگ ایسے رہے ہیں جنہوں نے اپنے فہم اور سمجھ کے مطابق اُن کا حل پیش کیا۔ کبھی وہ حل کارگر ہوا اور کبھی نہ ہوا، اور کبھی ہوا تو عارضی ہوا۔

مشاہدات کی دنیا میں ایک طویل سفر کرنے کے بعد آج کی دنیا میں کچھ ایسے لوگ ضرور موجود ہیں جو یہ تسلیم کرتے ہیں کہ انسانوں کو پیش آنے والے مسائل کے وہ حل جو انسانوں ہی نے اپنی فہم اور سمجھ بوجھ کے مطابق پیش کئے وہ عارضی ہی رہے۔ جبکہ مستقل حل صرف ان نفوسِ قدسیہ نے پیش کیا کہ جو ان مسائل کا حل اللہ ﷻ سے لیکر تشریف لائے۔ آج کی دنیا میں یہ حقیقت مسلمہ و ثابت شدہ ہے۔

فلسفہ اشتراکیت کا بانی کارل مارکس ہے۔ یہ فلسفہ اسی کے نام سے موسوم ہو کر مارکس ازم بھی کہلاتا ہے۔ کارل مارکس نے اپنے زمانے میں غریب مزدوروں اور کسانوں پر ہونے والے مظالم کو دیکھ کر انسانیت کے ناطے، ظالموں اور جاہلوں کے سامنے صف بندی کی کوشش کی۔ بد قسمتی سے ظلم کرنے والے طبقے میں مذہب کا نام لینے والے اہل کلیسا بھی موجود تھے۔ بلکہ بعض محققین کی رائے یہ ہے کہ اہل کلیسا بھی طبقہ اشتراکیہ میں شامل تھے اور انہوں نے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں سے مل کر غریب مزدوروں اور کسانوں پر عرصہء حیات تک کر رکھا تھا۔ اسی ظلم و جبر کا نتیجہ اشتراکیت ہے۔ اور جیسا کہ پہلے ذکر ہوا کہ ظالموں اور جاہلوں کی صف میں اہل مذہب بھی تھے جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ فلسفہ اشتراکیت نے سرے سے مذہب کا انکار کیا اور مذہب کی بیخ کنی کی۔ اور اس فلسفہ کے بانی کارل مارکس نے مذہب کی

توہین کی اور مذہب کو انیون سے تشبیہ دی۔

اس پوری بحث سے یہ بات ثابت ہوئی کہ مارکس ازم کی بنیاد مذہب سے انکار پر ہے۔ تو جس نظریہ حیات میں سرے سے مذہب موجود ہی نہ ہو، وہ نظریہ حیات تادیر قائم نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ دنیا نے دیکھا کہ بیسویں صدی کے آغاز پر شروع ہونے والا یہ نظریہ صدی کے اختتام سے پہلے ہی زمیں بوس ہو گیا۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس نظریہ نے ایک کثیر خلق خدا کو متاثر کیا۔

فلفلہ اشتراکیت سے کچھ مسلم زعماء بھی متاثر رہے ہیں۔ اسکا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے مابین اسلامی اشتراکیت اور اسلامک سوشلزم کی ترکیب بھی وضع کی گئی۔ لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ کے فضل و کرم سے بروقت علماء کرام نے اس ترکیب فاسد کا رد کیا اور اس سلسلہ میں قائم کئے جانے والے تمام دلائل کا کتاب و سنت کی روشنی میں جواب دے کر حق کو واضح کر دیا۔

جس طرح کہ اشتراکی سوالات حضرت شیخ الاسلام مدنی میاں صاحب کے سامنے پیش کیے گئے، وہ سوالات ہیں ہی مذہب کے انکار کی بنیاد پر، جسکا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ جب اشتراکیت نے مذہب کا انکار کیا تو ان کے سامنے دین و مذہب کی کوئی حیثیت باقی نہ رہی اور اس طرح انہوں نے وجود باری تعالیٰ کا بھی انکار کیا اور وہ اشتراکی اس حقیقت کو فراموش کر گئے کہ مذہب بھی انسان کی بنیادی ضروریات میں سے ہے جس طرح کہ دیگر ضروریات۔ اس موضوع پر مزید کلام کی بہت گنجائش ہے لیکن بحث طویل ہو جائے گی۔

حضرت شیخ الاسلام نے اشتراکی سوالات کے جوابات کیلئے سالکین کو ابتداءً دو خانوں میں تقسیم کیا، پھر مزید تقسیم کیا اور مزید تقسیم کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ اسی طرح تقسیم در تقسیم کرتے جائیں تو عقلی طور پر اور بہت سی تقسیمیں ظہور پذیر ہو سکتی ہیں جن

ذکر طوالت تحریر کا باعث ہے۔

یہ امر واقعہ ہے کہ سائلین کو ان خانوں میں تقسیم کئے بغیر ان سوالات کے جوابات دینا ممکن نہیں ہے جو حضرت شیخ الاسلام کے سامنے پیش کئے گئے۔ حضرت شیخ الاسلام نے ان سوالات کے بہترین جوابات از روئے روایات و درایت بہت عمدگی کے ساتھ تحریر فرمائے ہیں اور ہر سوال کے جواب میں مختلف قسم کے سائلین کو پیش نظر رکھ کر اطمینان بخش جواب دیا ہے۔

چونکہ سوالات میں اسلام کے معتقدات و معاملات، ہر دو پر سائل حملہ آور ہوا ہے، چنانچہ حضرت شیخ الاسلام نے دلیل و برہان سے اسلامی معتقدات و معاملات کا دفاع کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کو پڑھنے اور سمجھنے کی اور اسکی روح کے عین مطابق عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ ﴿ آمین ﴾

--- ﴿ دوسرا مقالہ --- ”تین سوالوں کے جواب“ ---

یہ ایک مختصر سا مقالہ ہے جو درحقیقت لٹریچر کی دنیا سے وابستہ رہنے والی ایک خاتون نے جون پور شہر سے قبلہ مدنی میاں صاحب کی خدمت میں پیش کئے تھے اور تحریری جواب کی فرمائش کی تھی۔ ان تینوں سوالات پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے ہی یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ سائلہ نے ان تاریخی کتابوں کا از خود مطالعہ کیا ہے جن میں ہر طرح کا رطب و یابس موجود ہے۔ یا پھر ایسی کتابیں ان کے زیر مطالعہ رہی ہیں جن کے مصنفین نے تاریخی واقعات و حادثات سے محض اپنے فہم کی بنیاد پر نتائج اخذ کئے اور بین السطور ابھرنے والے سوالات تک یا تو ان مصنفین کی نظر ہی نہیں گئی یا ارادۃً ان کے جوابات نہیں دئے جس کا لازمی نتیجہ گمراہ ہونے اور گمراہ کرنے کی صورت میں ظاہر ہوا۔

حضرت شیخ الاسلام قبلہ مدنی میاں صاحب نے ان تینوں سوالات کے جواب کیلئے جو تمہیدی مقدمہ قائم کیا ہے اس تمہید میں حقیقتاً ان سوالات کے بطن میں جو مزید کئی سوالات تھے ان کے جوابات موجود ہیں۔ قاری پر اس مقالہ کے پڑھتے ہوئے یہ ساری حقیقتیں منکشف ہوگی۔

--- ﴿ تیسرا مقالہ --- 'تحريم و فلسفہ تحریم' --- ---

دوسرے مقالہ کی طرح یہ تیسرا مقالہ بھی ایک مختصر مقالہ ہے اور جو مسئلہ اس مقالہ میں زیر بحث ہے وہ بنیادی طور پر رسول اکرم ﷺ کے تشریعی اختیارات سے متعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان مجموعہ مقالات میں چوتھے نمبر پر ایک تفصیلی مقالہ ہے بنام 'رسول ﷺ کے تشریعی اختیارات' موجود ہے۔ اس مقالہ میں بھی یہ بحث تمام و کمال موجود ہے۔

'تحريم و فلسفہ تحریم' میں قبلہ مدنی صاحب نے عملی و تحقیقی انداز سے اس بحث کو اجاگر کیا ہے کہ قرآن و حدیث میں جہاں کہیں تحریم و تحلیل کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف کی گئی ہے، وہاں تحریم و تحلیل سے کیا معنی مراد ہے؟ حقیقی یا مجازی۔ اور یہ کہ ان میں سے کون سا معنی مراد لیں تو احادیث میں تعرض پیدا ہوگا۔ اور دفع تعارض کی کیا صورت ہوگی۔ اس پوری بحث سے آگاہی حاصل کرنے کیلئے 'تحريم و فلسفہ تحریم' کو کبریٰ نظر سے مطالعہ کیجئے۔

--- ﴿ چوتھا مقالہ --- 'رسول اکرم ﷺ کے تشریعی اختیارات' --- ---

یہ مقالہ جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے، قبلہ مدنی میاں مدظلہ العالی کے والد ماجد رئیس المتکلمین حضور محدث کچھوچھوئی جو محدث اعظم ہند کے نام سے مشہور و معروف

ہیں، انکی خدمت میں ایک استفتاء پیش کیا گیا جسکا بنیادی تعلق رسول اکرم ﷺ کے تشریحی اختیارات سے تھا۔ حضرت محدث اعظم ہند نے بھرپور محدثانہ و محققانہ شان کے ساتھ استفتاء کا جواب دیا۔ جس حدیث کو بنیاد بنا کر مستفتی نے سوال کیا تھا اس حدیث کو پوری سند اور اس دعویٰ کے ساتھ بیان کیا کہ اس حدیث کے سارے راوی، ثقہ اور رجال صحیح مسلم سے ہیں اور اپنے جواب کو بالترتیب درج ذیل قرآنی آیات سے مستحکم کیا۔

☆ سورة الاعراف، آیت ۱۵۷ ☆ سورة التوبہ، آیت ۲۹

☆ سورة الاحزاب، آیت ۳۶ ☆ سورة الحشر، آیت ۷

مزید یہ کہ حضرت محدث کچھوچھوی علیہ الرحمہ نے اپنے اس جواب کو مستحسن کیا سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے اس بیان سے کہ جو احکامات کتاب اللہ سے ثابت ہوں وہ اقویٰ ہیں، بہ نسبت ان احکامات کے جو سنت سے ثابت ہوں۔ اسلئے کہ وہ قویٰ ہیں۔ کیونکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے جتنے احکامات اپنے فرمودات کے ذریعے ہمیں عطا کئے وہ اللہ ﷻ کی طرف سے ملنے والے اختیارات کی بدولت ہیں۔ اسی لئے جو حکم اللہ ﷻ کتاب اللہ میں فرمائے وہ فرض و اقویٰ ہے اور جو حکم رسول اللہ ﷺ ارشاد فرمائیں وہ واجب اور قویٰ ہے۔

حضرت شیخ الاسلام نے اپنے اس مقالہ میں اپنے والد ماجد کے اس فتویٰ کی شرح اور حاشیہ آرائی اور مزید تحقیق و تخریج کی ہے۔ اور جس طرح حضور محدث اعظم ہند نے استفتاء کے جواب میں تحقیقی انداز سے اپنے مدعا کو ثابت کیا اُسی طرح حضرت شیخ الاسلام نے اپنے شرح و حاشیہ میں تحقیق و تدقیق کا عملی مظاہرہ کیا ہے۔ چنانچہ احادیث کی تخریج فرمائی اور مکمل حوالہ جات تحریر کئے ہیں اور رجال حدیث پر کلام کیا ہے۔ اسماء الرجال کی مستند کتابوں کا حوالہ دیا ہے، فقہ اور حدیث کے اصولوں سے بحث کی ہے، اصول فقہ اور اصول حدیث کی مسلمہ کتب کا حوالہ بھی موجود ہے۔

قبلہ مدنی میاں صاحب نے اپنے اس تخیل میں حاشیہ نمبر ۱۰ کے تحت احادیث کی اقسام مثلاً: صحیح، حسن، ضعیف، موضوع وغیرہ بیان کرتے ہوئے اہلسنت کے ایک معروف مفسر و محدث، حکیم الامت مفتی احمد یار خان نعیمی علیہ الرحمہ کی مشہور کتاب 'جاہ الحق' کا حوالہ دیا ہے۔ اگر اس کے ساتھ شرح 'نخبہ الفکر' ابن حجر عسقلانی اور شرح 'شرح نخبہ الفکر' ملا علی قاری کا بھی حوالہ دے دیتے تو بہتر ہوتا۔ مختصر یہ کہ شرح و معاشیہ بہت تحقیقی ہے، علمی و فکری معلومات سے لبریز ہے، اس پر مستزاد یہ کہ آخر میں 'نملہ' کے نام سے سوال و جواب پر مشتمل مزید معلومات مندرج ہیں، جس کا موضوع فن سے گہرا تعلق ہے۔ اس طرح یہ مقالہ رسول اکرم ﷺ کے تشریفی اختیارات کے حوالے سے پڑھنے والے کیلئے نہ صرف بہترین معلومات کا ذریعہ ہے بلکہ اس موضوع پر مزید تحقیق و تفتیش کرنے کیلئے بنیاد بھی موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے استفادہ کرنے کی توفیق رفیق مرحمت فرمائے۔ ﴿آمین﴾

آج کی دنیا

لڑ بچہ کی دنیا سے وابستہ ہر شخص بخوبی جانتا ہے کہ آج کی دنیا میں بہت تیزی سے بدلتے ہوئے حالات، افکار و خیالات پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ جس سے زندگی میں ایک پائل سی پیدا ہو گئی ہے اور امت مسلمہ عملی زندگی میں اخلاق و کردار کے حوالہ سے قہر مذمت میں گرتی جا رہی ہے۔ اس سے بڑھ کر سانحہ یہ ہے کہ عقیدہ و ایمان کے باب میں قرآن و حدیث کی تفسیر و تشریح اور تعبیر و توضیح کے باب میں بھی انت نئے افکار و خیالات پیش کئے جا رہے ہیں۔ اندریں صورت، افکار صحیحہ کو افکار کا سدہ سے، حق کو باطل سے، خیر کو شر سے، بلکہ یوں کہتے کہ کفر کو اسلام سے، ممتاز کرنے کیلئے جس علم و میزان کی ضرورت ہے، اہل علم و دانش سے وہ مخفی نہیں۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ

وقت کے علماء کرام، دانشوران عظام اور اصحاب طریقت، امت مسلمہ کی رہنمائی کریں۔
 آج کی دنیا میں بد قسمتی سے امت مسلمہ مختلف طبقات میں بٹ چکی ہے۔ ایسے میں جب
 ہم اہلسنت پر نظر ڈالتے ہیں تو دور دور تک کوئی روشنی نظر نہیں آتی، اگرچہ اللہ ﷻ کے فضل و
 کرم سے باصلاحیت افراد کی کوئی کمی نہیں مگر وجوہات مختلف ہیں جو اہل نظر سے مخفی نہیں۔
 آج عوام اہلسنت میں بہت سی نگاہیں منتظر ہیں ایسے علمی و فکری مضامین و
 مقالات کے، ملفوظات و کتابوں کے، جو عصر حاضر کا ساتھ دیں اور اصلاح احوال، اور
 تعمیر شخصیت و کردار میں مدد و معاون ہوں۔۔۔

۔۔۔ ہم تو یہی کہہ سکتے ہیں۔۔۔

شاید تمہیں نصیب ہو اے کشتگان شب

لوح افق پر صبح کے آثار دیکھنا

غلام جیلانی اشرفی

کراچی، پاکستان

March 31, 2004



اشتراکی سوالات کے اسلامی جوابات

ہر مجیب کیلئے ضروری ہے کہ وہ جوابات دینے سے پہلے اپنے سائل کی پوزیشن کو اچھی طرح سمجھ لے تاکہ اس کا جواب مقتضائے حال کے مطابق ہو اور اسے غیر فصیح ملزنگاشر نہ اختیار کرنا پڑے۔ جملہ سائلین کو دو خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

﴿الف﴾ --- وہ سائل جو دائرۃ اسلام میں رہ کر سوال کرے۔

﴿ب﴾ --- وہ سائل جو دائرۃ اسلام سے باہر رہ کر سوال کرے۔

دائرۃ اسلام سے باہر رہ کر سوال کرنے والوں کی بھی دو خانوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے۔

﴿ا﴾ --- وہ سائلین جو ساری کائنات کے وجود کو بخت و اتفاق کا مرہون نہ سمجھتے ہیں اور کسی ایسی ہستی کا تصور نہیں رکھتے جو کائنات کی 'باشعور خالق' ہو۔

﴿ب﴾ --- وہ سائلین جو بالکل اسکے برعکس عقیدہ رکھتے ہوں اور کائنات کو ایک 'باشعور خالق' کا عطیہ سمجھتے ہیں۔

اس دوسری تقسیم کی شق ثانی کیلئے بھی یوں دو خانے بنائے جاسکتے ہیں۔

﴿ا﴾ --- یہ ان کا خانہ ہے جو کائنات کے 'باشعور خالق' کو اس کی ذات، نیز اسکے جملہ صفات و کمالات میں 'وحدۃ لا شریک' مانتے ہیں۔

﴿ب﴾ --- یہ ان کا خانہ ہے جو کائنات کے 'باشعور خالق' کی ذات و صفات، یا صرف ذات، یا صرف جملہ صفات، یا بعض صفات میں کسی غیر کو شریک

جانتے، مانتے اور ٹھہراتے ہیں۔

اسی طرح اگر تقسیم در تقسیم کرتے جائیے تو عقلی طور پر اور بھی بہت ساری تقسیمیں ظہور پذیر ہو سکتی ہیں۔ جن کا ذکر طوالت تحریر کا باعث ہے۔

یوں بھی۔۔۔ جس حقیقت کی وضاحت میرا مقصود نظر ہے اس کے لئے یہی مذکورہ بالا تین تقسیمیں کافی ہیں۔۔۔ اگر کوئی سائل 'تقسیم ثانی' کی 'شق اول' سے متعلق ہو، یعنی خدا کے وجود کو نہ مانتا ہو۔ اور وہ رسالت و نبوت، امامت و خلافت، جنت و دوزخ، مبداء و معاد، حور و ملک، قبر و حشر اور احکامات اسلامیہ، وغیرہ، وغیرہ سے متعلق سوال کر رہا ہو تو اس سے ان موضوعات پر بحث و تحقیق ایک 'قبل از وقت'، مقتضائے حال کے خلاف غیر موثر اقدام ہے۔ ایسی تمام بحثوں کا نتیجہ ہمیشہ غیر مفید رہا ہے۔ اس نوع کی گفتگو کا نتیجہ خیز ہونا ایک 'نادر الوجود' چیز ہے، جس کے پیچھے لگنا وقت و محنت کا صحیح مصرف نہیں۔

ایسے سائلین سے آغاز سخن ایک ایسی ہستی کے وجود سے ہونا چاہئے جو کائنات کی 'باشعور خالق' ہو۔ اس منزل سے گزرنے کے بعد اسکی توحید اور پھر اسکے بعد اسکی دوسری صفات کو مناسب ترتیب کے ساتھ زیر بحث لانا چاہئے۔

غور فرمائیے کہ کس قدر بے محل چیز ہے کہ ایک شخص خدا کو نہیں مانتا اور آپ اس سے خدا کو منوائے بغیر خدا کی توحید منوانے کے درپے ہیں۔۔۔ ایسے ہی ایک منکر، خدا کی ذات و صفات سے انکار کر رہا ہے اور آپ اس سے رسالت و نبوت کے متعلق جھگڑ رہے ہیں، وغیرہ، وغیرہ۔

میرے کلام کا یہ منشاء نہیں کہ ایسے جملہ سائلین سے کسی نوع کی گفتگو ہی نہ کی جائے اور انکے سوال کو سن کر خاموشی کا رویہ اختیار کیا جائے، بلکہ مقصود کلام یہ ہے کہ اپنے کو انکے موضوع کا پابند نہ بنایا جائے۔ بلکہ انکو اپنے موضوع کا پابند کر لیا جائے

اور جہاں سے منکر کے انکار کا آغاز ہو، وہیں سے بحث کی ابتداء کی جائے۔۔۔ ایسی صورت میں لا حاصل باتوں سے نجات مل جائے گی اور منکر کے انکار کے پردے کو بھی چاک کیا جاسکے گا۔۔۔ ایسے موقع پر بالکل یہ خاموشی بھی نقصان دہ ہے۔ اس طرح منکر اپنے انکار میں جبری ہو جاتا ہے اور اس کے خیالات کا بطلان اس پر واضح نہیں ہو پاتا۔۔۔

اس مختصری تمہید کے بعد میں پروفیسر صاحب کی خاص توجہ چاہوں گا۔ آپ کے توسط سے میرے پاس جو سوالات آئے ہیں وہ بقول آپ کے 'ترقی پسند کمیونسٹ طبقہ کی طرف سے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اسلام اور کمیونزم میں وہی فرق ہے جو آگ اور پانی میں ہے۔ اسی لئے جو کمیونسٹ ہے، وہ مسلمان نہیں اور جو مسلمان ہے وہ کمیونسٹ نہیں۔ یہاں کمیونسٹ سے مراد وہ حقیقی کمیونسٹ ہیں جو 'تقسیم ثانی' کی 'شق اول' کے تحت آتے ہیں۔ لہذا وہ غافل و نادان مسلمان جو کمیونزم کے عقائد و نظریات سے بالکل بے خبر ہیں، اور صرف 'کمیونسٹ پارٹی' کو ووٹ دینے سے اپنے کو کمیونسٹ تصور کرتے ہیں، اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں۔

ایسے لوگوں کے جواب میں وہی رویہ اختیار کرنا علمی نقطہ نظر سے سودمند ہے، جس کی طرف میں اشارہ کر چکا ہوں۔ آپ کا اپنے مکتوب میں یہ اعتراف کہ 'کمیونسٹوں اور مسلمانوں میں بنیادی اختلاف عقیدہ توحید سے ہوتا ہے، بتا رہا ہے کہ آپ نے ابھی کمیونزم کا گہرا مطالعہ نہیں کیا ہے ورنہ آپ کو یہ اعتراف کرنا پڑتا کہ اسلام اور کمیونزم کے درمیان توحید سے پہلے، 'وجود خدا' ہی سے اختلاف کا آغاز ہو جاتا ہے۔ کمیونزم لا دینی نظریہ فکر کا حامل ہے جس میں کائنات کے کسی خالق کا تصور نہیں۔ لہذا اس کا نظریہ ہر اس نظریے سے متصادم ہے جسکی اساس دین و مذہب پر ہے، اور جس میں ایک خالق کا تصور بابا جارہا ہو۔ خواہ وہ تصور کتنا ہی ناقص کیوں نہ

ہو۔۔۔ آپ کا یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ اسلام کا فلسفہ اجتماعیت کیوزم کے فلسفہ اشتراکیت کے مشابہ ہے۔۔۔ اسلئے کہ اسلام کے سارے فلسفہ اجتماعیت کا دار و مدار اس کے کامل و مکمل تصور آخرت پر ہے۔ اسلام نے آخرت کا جو تصور پیش کیا ہے اور اس تصور کی اساس پر انسان کی اخلاقی قدروں کی جو حفاظت فرمائی ہے وہ بے نظیر ہے۔ کوئی ازم اس کا جواب نہیں رکھتا۔

اسلام کے نظام حیات سے اگر اسکے تصور آخرت کو نکال دیا جائے تو اس کا نظام اخلاق و فلسفہ اجتماعیت درہم برہم ہو جائے اور دوسرے ازموں کی طرح اس کا مقصد بھی کم سے کم عیش و نشاط کی کاجوئی اور زیادہ سے زیادہ اقوام عالم پر بے محابہ چیرہ دستی کے سوا کچھ نہ رہ جائے۔۔۔ کیوزم، جہاں آخرت کا کوئی تصور نہیں، کہاں اسکا فلسفہ اشتراکیت اور کہاں اسلام کا نظام حیات اور اسکا فلسفہ اجتماعیت!۔۔۔ غور فرمائیے کہ اس فلسفے کا جس کی اساس دین ہو، اس فلسفے سے کیا جوڑ ہو سکتا ہے جو لادینیت پر مبنی ہو!

اب آئیے، تصویر کا دوسرا رخ ملاحظہ فرمائیے۔ اگر آپ کے فرستادہ سوالات کے سائلین بالفرض تقسیم اول کی شق اول سے متعلق ہوں۔ یعنی مسلمان ہوں، تو انکے سوال کا مقصد زیادہ سے زیادہ ان عقلی حکمتوں کی دریافت ہے جو ان احکامات کے پیچھے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کسی فعل کی حکمت صحیح معنوں میں وہ حکیم ہی سمجھ سکتا ہے جو اس فعل کا فاعل مختار ہے۔ اب اگر وہ خود ہی اپنے فعل کی حکمت بیان فرمائے، یا کسی کے ذریعہ واضح کرائے، تو وہ حکمت ایک قطعی حیثیت کی حامل ہوگی۔ اور اگر ایسی صورت نہ ہو بلکہ دوسرے حکماء کسی حکیم کے فعل کی حکمتوں کو ظاہر کریں، تو انکی حیثیت ظن و تخمین سے زیادہ نہیں۔ اسلئے کہ فعل کسی کا ہے اور حکمتوں کے ظاہر کرنے کی کاوش ذہنی کسی اور کی۔ لیکن یہ کاوش اشارہ کر رہی ہے کہ کسی حکیم کا فعل حکمت سے

خالی نہیں ہوا کرتا۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ ہمارا دماغ اسکی حکمتوں کے جھنجھے سے قاصر رہے، لیکن یہ ناممکن کہ ہم اسکو کسی ایسے کا فعل قرار دے کر، جو صرف حکیم ہی نہیں بلکہ خالق حکمت بھی ہے، اس فعل کے پر حکمت ہونے سے انکار کر دیں۔۔۔ بہ لفظ دیگر۔۔۔ یہ تو ممکن ہے کہ ہماری سمجھ بوجھ کی قوت اسکے افعال کی حکمتوں کو سمجھ نہ سکے جس نے یہ قوت پیدا کی ہے۔ لیکن یہ ناممکن ہے کہ ہماری 'قوت اور اکیہ' جس سے آج ہم اسکی حکمتوں کی چھان بین کر رہے ہیں، کے پیدا کرنے والے کا کام حکمت سے خالی ہو۔۔۔ الحاصل۔۔۔ کسی کو فاعل مختار، حکیم مطلق بلکہ خالق حکمت مان کر اس کے افعال کو حکمت سے خالی گمان کرنا کوئی سختندانہ طرز فکر نہیں۔۔۔ اس گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ سوالات کے جوابات کے تحت، احکامات اسلامیہ کی جن حکمتوں کی طرف میری جانب سے اشارہ ہوگا، ان کا 'منصوص' ہونا غیر ضروری ہے اور 'حکمت منصوصہ' نہ ہونے کی صورت میں کسی صاحب علم و حکمت کا اس سے اچھی حکمت ظاہر کر دینے کا امکان بہر حال اپنی جگہ پر رہے گا۔ ہاں اتنا ضرور عرض کروں گا کہ ان سوالات کے تیور کو دیکھ کر اس کا انتساب کسی مسلمان کی طرف کرتے ہوئے جی کانپ جاتا ہے۔۔۔ اب اپنا پہلا سوال اپنے ہی الفاظ و عبارت کے ساتھ ملاحظہ فرمائیے:

’خدا سب سے زیادہ متمول ہے۔ دنیا کے دولت مندوں، بادشاہوں اور امیروں کی طرح وہ بھی صرف اپنے ہی حکم کی تعمیل پر زور دیتا ہے۔ جگہ جگہ قرآن میں اس کا یہ ارشاد کہ دوسروں کی اتباع مت کرو اور صرف میرے حکم کو مانو، اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ دوسرے متمول لوگوں سے حسد و بغض رکھتا ہے۔‘

یہ سوال اس بات کی وضاحت کر رہا ہے، کہ سائل اس منزل سے سوال کر رہا ہے جہاں ایک ہستی کو خدا مان لیا گیا ہے۔ نیز سائل کے ذہن میں ایک ایسی ذات کا

تصور ضرور ہے جو کائنات کی 'باشعور خالق' ہے۔ کسی کو خدا مان لینے کا مطلب اسکے سوا اور کیا ہے کہ اسکو اپنا حقیقی حاکم، رازق، خالق، مقتدر اعلیٰ، غنی، علی الاطلاق، مختار کل اور حکیم مطلق وغیرہ مان لیا گیا ہے۔ اور جب آپ نے اس ہستی کو یہ سب کچھ مان لیا ہے تو لازمی طور پر اپنے کو اس کا محکوم، مرزوق، مخلوق، مقدر، محتاج، مجبور اور اسکی حکمتوں کا مرقع تسلیم کر لیا ہے۔ بندے کی فطرت بندگی ہے اور بندگی اس قوت و توانائی کے مقابلہ میں کی جاتی ہے جو بندگی کرنے والے پر قہر و غلبہ اور قدرت و استیلاء رکھتی ہو۔ اور وہ بھی ایسے کہ بندہ کو اسکے حکم سے سرتابی کی مجال نہ ہو۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ایسی قوت و توانائی جسکے اوپر کسی قوت کا تصور نہ ہو، ایسا قہر و غلبہ جسکے اوپر کوئی قاہر و غالب نہ ہو، ایسی قدرت و استیلاء جسکے کسی قدرت و استیلاء کے تحت رہنے کا کوئی واہمہ تک نہ ہو، جس ذات میں مان لیا جائے، درحقیقت وہی خدا ہے۔ اسکے سوا اور جو کچھ عالم وجود میں آیا، سب اسی کا فیضان کرم ہے۔ خواہ وہ امیر ہو یا اسکی امیری، دولت مند ہو یا اس کی دولت مندی، حاکم ہو یا اس کی حکومت۔۔۔

خیال رہے کہ خدا اور بندے کا تعلق وہ نہیں جو راعی اور رعایا، دنیاوی حاکم اور دنیاوی محکوم، سپہ سالار اور سپاہی، امیر و غریب، ایک معاصر اور دوسرے معاصر، ایک ہمسایہ اور دوسرے ہمسایہ، ایک عالم اور ایک جاہل، ایک انسان اور دوسرے انسان، نیز ایک مخلوق اور دوسری مخلوق کے درمیان ہے۔ بلکہ خدا اور بندے کا تعلق وہ ہے جو ایک مخلوق کو اسکے خالق، ایک مرزوق کو اسکے رازق، ایک مقدر کو اسکے علی الاطلاق قادر، ایک محکوم کو اسکے حقیقی حاکم اور ایک مربوب کو اسکے رب سے ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کسی ذات کو خدا مان کر، اپنے اور اسکے مابین، اُس تعلق کو نہ ماننا ایسا ہی ہے جیسے کوئی سورج کو مانے اور اسکی روشنی کو نہ مانے، چاند کو تسلیم کرے اور اسکی چاندنی سے انکار کرے، آگ پر ایمان لائے اور اسکی حرارت کا منکر ہو۔۔۔ یا یوں کہہ لیجئے۔۔۔ کہ

ایک ہی وقت میں وجودِ کس کو بھی مانے اور رات کی موجودگی کو بھی، آگ کو بھی تسلیم کرے اور اس کے ساتھ بروقت کو بھی، وغیرہ وغیرہ۔

۔۔۔ الحاصل۔۔۔ خدا کو مان کر مذکورہ بالا تعلق کو ماننا ناگزیر ہے۔ اور اس تعلق کو تسلیم کر لینے کے بعد مسائل کا سوال 'اہمالِ سرائی' کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا۔ مسائل نے یہ غور نہیں کیا کہ جسکے دل میں جذبہ بغض و حسد ہوا کرتا ہے، اسکی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے محسود سے بڑھتا جائے اور اس کا محسود گرتا جائے اور اگر وہ خود آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو کم از کم اتنا تو ہو کہ اس کا محسود بھی ترقی نہ کر سکے۔ اسی لئے اگر حسد اپنی خواہش کے خلاف اپنے محسود کو ترقی کرتا ہوا دیکھتا ہے تو اسکے دل میں ایک قسم کے جلن پیدا ہوتی ہے۔ اور وہ اپنی ہی آگ میں جلتا رہتا ہے۔ کیا کرے مجبور ہے کہ وہ اپنے محسود کی ترقی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک سکے کی قدرت بھی نہیں رکھتا، تو اب جلنے کے سوا اسکے پاس رہ ہی کیا جاتا ہے۔۔۔ یہ ہے بغض و حسد۔۔۔ جو ایسی ہی دو ہستیوں کے مابین ہو سکتا ہے، جن میں ایک خدا اور دوسرا اس کا بندہ نہ ہو۔

۔۔۔ نیز۔۔۔ ایک کو دوسرے پر اقتدار کی حاصل نہ ہو۔ خدا اپنے بندے سے حسد کرے، آخر اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟ امارت و حکومت سے نوازنے والا کیا امارت و حکومت کو چھین نہیں سکتا؟ کسی کو عزت کی کرسی پر بٹھانے والا کیا اس کو اس کرسی سے اتار نہیں سکتا؟ اگر خدا کا یہی ارادہ ہو جائے کہ کسی حاکم کی حکومت نہ چلے، تو وہ اس کیلئے یہ نہیں فرمائے گا کہ اے لوگو! میری مانو اور کسی کی نہ مانو۔ بلکہ وہ اپنی قدرت کاملہ کا وہ کرشمہ دکھائے گا کہ دنیا میں نہ کوئی کسی کا حاکم رہ جائے گا نہ محکوم۔۔۔ لیکن خدا کا یہ ارادہ نہ ہوا بلکہ اس نے اپنی مخلوقات میں بعض کو تخت حکومت پر بٹھایا، ان کو طرح طرح کی نعمتوں سے نوازا اور یہ طاقت دی کہ وہ اپنے خالق کے حکم کے خلاف اپنے ذاتی حکم نافذ کر سکیں۔۔۔ تاکہ دنیا والے دیکھ لیں ان نفوسِ قدسیہ کو جو

کڑی سے کڑی منزل میں بھی خدا ہی کے آگے جھکنا جانتے ہیں اور ظاہر ہو جائے کہ کون خدا کا بندہ ہے اور کون طاعت کا غلام۔۔۔ سائل اگر بغض و حسد کی حقیقت کو سمجھ لیتا تو ہرگز ہرگز ایسا عامیہ سوال نہ کرتا۔ خدا کو متمول کہنا بھی سائل کی جہالت ہے۔ خدا متمول نہیں بلکہ 'خالق متمول' ہے۔۔۔۔۔ جہاں جہاں متمول ملے گا اسی کے فیضانِ تخلیق کا عطیہ ہے۔۔۔۔۔ یاد رہے کہ امت مسلمہ کے اندر یہ مسئلہ 'جماعی' ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماءِ توقیفی ہیں۔ لہذا اس کو کسی نام سے موسوم کرنا اسلامی نقطہ نظر سے ناروا ہے، جب تک وہ اسم شرعاً 'منقول' نہ ہو۔۔۔۔۔ اس سوال کو دیکھ کر مجھے لڑکا الٹی بہتی ہوئی نظر آتی ہے۔ سوال کا لب و لہجہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ:

'جب خدا ہی ساری کائنات کا خالق اور سب کا حقیقی مالک ہے اور اسی نے دولت مندوں کو دولت، امیروں کو امیری، بادشاہوں کو بادشاہی عطا فرمائی۔ اور ان امیروں، دولت مندوں کو اور بادشاہوں کو جسمانی و روحانی اور ظاہری و باطنی ساری نعمتیں اسی نے عنایت کی ہیں۔۔۔۔۔ الحاصل۔۔۔۔۔ انکے پاس جو کچھ ہے سب اسی کی دین ہے، تو پھر ان کو حق کیا پہنچتا ہے کہ یہ خدا کے قانون کے مقابلہ میں کسی قانون کا اختراع کریں اور خدائی نظام کے متوازی کسی نظام کی تشکیل کریں! اسی طرح خدا کی دوسری مخلوقات کو کیا حق پہنچتا ہے کہ جو ایسوں کے قانون کے آگے سر جھکائیں، جنکے قوانین خدائی قانون سے متصادم ہوں! وجود پائیں کسی سے، رزق کھائیں کسی کا، زندگی حاصل کریں کسی سے اور حکم مانیں کسی اور کا۔ آخر یہ کہاں کی وفاداری ہے؟ جب ہم خدا ہی کے بندے ہیں تو ہمیں اسکی غیر مشروط اطاعت کرنی چاہئے۔'

سوال کا صحیح رخ تو یہ تھا جو میں نے پیش کیا۔ لیکن سائل نے اس نقشے ہی کو الٹ دیا۔۔۔۔۔ کسی نے سچ کہا ہے۔۔۔۔۔

وحشت میں ہر ایک نقشہ الٰہی نظر آتا ہے
مجنوں نظر آتی ہے، لیلیٰ نظر آتا ہے

-- اب اس سائل کا دوسرا سوال ملاحظہ کیجئے:

”نماز پڑھنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ نماز ایک ایسی عبادت ہے جس میں عبادت کرنے والے کو باطہارت رہنا، پاک و صاف کپڑے پہننا، پاک و صاف جگہ پر عبادت کا انتظام کرنا اور دن بھر میں پانچ مرتبہ عبادت کیلئے وقت نکالنا ضروری ہوتا ہے۔ اس مشینی دور میں جبکہ انسان اور خاص کر غریب و مزدور طبقہ صرف ایک وقت کے کھانے کیلئے صبح سے شام تک محنت میں لگا رہتا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ باطہارت رہ سکے؟ نماز کیلئے پاک و صاف کپڑے مہیا کر سکے؟ کارخانوں کے غلیظ ماحول میں عبادت کیلئے جگہ نکال سکے؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ دنیاوی تنگ و دو میں پانچ مرتبہ خدا کے سامنے حاضر ہو؟ یہی وجہ ہے کہ خود مسلمانوں کا بہت بڑا طبقہ نماز کو فرض تو ضرور سمجھتا ہے مگر اسکو پورا نہیں کر سکتا۔ نماز صرف وہ شخص ادا کر سکتا ہے جس کو معاشی خوش حالی حاصل ہو یا پھر وہ معاشی خوش حالی سے مستغنی ہو۔

جی چاہتا ہے کہ اس سوال کے جواب کا آغاز اقبال کے اس شعر سے کروں:

’یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے‘

ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات‘

اقبال کے اس شعر کی صداقت پر تاریخ کے اوراق شاہد ہیں۔۔۔ قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی جماعت، سرمایہ داروں، خوشحالوں، ٹانٹاؤں اور برلاؤں کی جماعت نہیں تھی، بلکہ اس جماعت کی اکثریت، مفلوک الحال، ستم خوردہ روزگار، اکثر اوقات بھوکے رہنے والے، پھٹے پرانے کپڑے پہننے والے اور کلیم پوش افراد پر مشتمل تھی۔

اسکے باوجود، قیصر و کسریٰ کی شوکت و سطوت بلکہ ہر طاعفوی طاقت ایسا لرزتی اور کانپتی تھی جیسے ہوا کے ایک نرم و نازک جھونکے سے تار عنکبوت تھر تھرا اٹھتا ہے۔ اس کا واحد سبب اس کے سوا کیا تھا کہ اس مقدس جماعت کا ہر فرد خدا کا سچا بندہ ہو چکا تھا۔

اور اب کسی طاقت کی مجال نہ رہی کہ اسے اپنا بندہ بنا سکے۔۔۔ خدا کا سچا بندہ بن کر کوئی دیکھے تو مسائل کیلئے جو کام نہایت دشوار ہے اس کیلئے آسان ترین ہو جائے۔۔۔ یہ اسلام ہی ہے کہ اس کی اکثریت ہمیشہ غریب رہی اور ہمیشہ غریب رہے گی۔ تاکہ دنیا کے سامنے یہ حقیقت آجائے کہ اسلام کی اساس اور اس کا فروغ سرمایہ داری اور دنیاوی اقتدار پر نہیں۔ صرف حقانیت اور صداقت پر ہے۔ لہذا اس کے دائرے میں سمجھ بوجھ کر آنے والا صداقت پسند اور حق پرست ہی ہو سکتا ہے۔۔۔ اگر آج کا بدقسمت مسلمان نمازوں سے کوتاہی برت رہا ہے تو اس کی وجہ اس کی غربت نہیں بلکہ اس کا سبب مذہبی جذبات کا فقدان اور خدا کے حقوق، نیز اپنی عہدیت کی حقیقت کا عدم شعور ہے۔۔۔ مسلمانوں کا جو بڑا طبقہ مسائل کو بے نمازی دکھائی پڑ رہا ہے تو اسکے خدا کے آگے سر نہ جھکانے کا سبب وہ نہیں ہے جو مسائل سمجھ رہا ہے، بلکہ وہ ہے جسکی طرف میں ابھی ابھی اشارہ کر چکا ہوں۔۔۔ خدا کے آگے پانچ وقت نہ جھکنے والے مسلمانوں کی اس سے عبرت تاک سزا اور کیا ہو سکتی ہے کہ انھیں نہ جانے کتنے درباروں میں اور نہ چائے کتنی مرتبہ سیر اطاعت شرم کرنا پڑتا ہے۔۔۔

مسلمانوں کی اسی عبادت کا یہ اثر تھا کہ آج برطانیہ کے دور کی جتنی ملیں موجود ہیں، سب میں مل کے اندر مسجدیں بنی ہوئی ہیں۔ ان مساجد کی ساری ضروریات کی کفالت مل کے ذمہ ہے۔ پتہ چلا کہ غیر مسلمین بھی اس عبادت کا اپنے طور پر احترام کرتے رہے۔ اب آج مسلمان ہی اس کا احترام نہ کرے تو کسی اور کو کیا پڑی ہے کہ ان کیلئے مسجد بنوا کر زبردستی نماز پڑھائے۔ مجھے تو یقین ہے کہ اگر سارے مل کے مزدور جو مسلمان ہیں

نماز پنج وقتہ کے پابند ہو جائیں تو مل کا مالک مجبور ہوگا کہ وہ انکے مذہبی جذبات کی قدر کرے اور پھر وہی انتظام کرے جو برٹش دور کی ملوں میں آج بھی ملتا ہے۔

میرا دعویٰ ہے کہ نماز پڑھنے والے کیلئے دنیا کی بڑی سے بڑی مصروفیت بھی رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ اور وہ بہر حال اپنی بیچ وقتہ نمازوں کیلئے چند منٹ نکال ہی سکتا ہے۔ جبکہ بیچ وقتہ نمازوں میں سے کوئی ایسی نماز نہیں جس کا پورا وقت ایک گھنٹے سے کم ہو۔ ایک گھنٹے کے اندر چند منٹ کا نکال لینا کون سا مشکل کام ہے!

رہ گیا طہارت کا مسئلہ۔۔۔ طہارت کیلئے اسلام میں تین ذرائع ہیں۔ اس میں اول الذکر دو، اصل کی حیثیت رکھتے ہیں اور تیسرا فرع کی۔ اول غسل، دوم وضو، سوم تیمم۔ تیمم غسل کی بھی فرع قرار پاتا ہے اور وضو کی بھی۔۔۔ اسکے متعلق فقہی احکام معلوم کرنے کیلئے بہار شریعت، قانون شریعت وغیرہ دیکھئے۔ غسل وضو پانی سے ہوتا ہے اور تیمم ہر اس چیز سے جو زمین کی جنس سے ہو۔ ہر اس چیز کو زمین کی جنس سے کہا جائے گا، جو آگ سے جل کر، نہ راکھ ہو، نہ کچھلے اور نہ نرم ہو۔ مثلاً مٹی، گرو، ریت، بالو، چونا، سرمہ، ہر تال، گندھک، مردہ سنگ، گیرو، پتھر، زبرجد، فیروزہ، عقیق، اور اس کے علاوہ دوسرے جواہر۔ ان تمام چیزوں پر تیمم ہو جائے گا، خواہ ان پر غبار نہ ہو۔ اسی طرح بھیگی مٹی (جبکہ مٹی غالب ہو) لکڑی اور کپڑے (جسکے اوپر اتنی گرد ہو کہ ہاتھ رکھنے سے نشان پڑ جائے)، گچے کی دیوار، پکی اینٹ، زمین اور جل کر سیاہ یا راکھ ہو جانے والے پتھر پر بھی تیمم کر سکتے ہیں۔۔۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ جس زمین پر نجاست گری اور خشک ہوگئی، اس سے تیمم نہ ہوگا، اگرچہ نجاست کا اثر باقی نہ ہو۔۔۔ اگر۔۔۔ نجاست کے گرنے اور پھر اس کے اسی طرح خشک ہو جانے کا علم یقینی ہو، جو بغیر مشاہدہ کے حاصل نہیں ہوتا، صرف شبہ اور وہم سے کچھ نہیں ہوتا۔

طہارت جسمانی کی شرعی صورتوں کو سامنے رکھیے اور بتائیے، کیا کوئی ایسی

صورت بھی عالم وقوع میں آسکتی ہے جس میں بدنی طہارت کے کسی ذریعہ کے حصول کے تعذروا استحالہ کے وقت کوئی دوسرا ذریعہ طہارت میسر نہ آ سکے۔۔۔ بالفرض۔۔۔ ایسی صورت آ بھی جائے کہ کسی مقام پر طہارت کا حصول متعذرو مستحیل ہو، جب بھی یہ اجازت نہیں کہ اس کو ترک صلوٰۃ کا بہانہ بنایا جائے۔ ایسوں کیلئے نماز کیلئے قلبی طہارت کافی ہے۔ عورتوں کے بعض حالات اس سے مستثنیٰ ہیں۔ (تفصیل کیلئے کتب فقہ دیکھئے)۔

اس پر طہارت لباس کو بھی قیاس کر لیجئے۔ بالفرض اگر کسی کو پاک و طاہر لباس میسر نہ ہو، نیز میسر نہ آ سکے تو اسکو جیسا اور جتنا میسر آئے اسی سے ستر پوشی کرے اور نماز پڑھے اور اگر بالفرض کپڑا ہی میسر نہ آئے اور گھاس پھوس پتے وغیرہ سے بھی ستر پوشی ممکن نہ ہو تو برہنہ ہی نماز پڑھے۔ ایسی صورت میں خشیت الہی کی وہ چادر ہی اس کیلئے کافی ہے جو اسکے دل و دماغ کو محیط ہے۔ مگر ایسی صورت میں کھڑے ہونے کے بجائے بیٹھ کر نماز پڑھے اور اشارہ سے رکوع و سجدہ کرے۔ اب رہ گیا جگہ کی طہارت کا مسئلہ تو اسلامی نقطہ نظر سے ہر وہ جگہ نماز پڑھی جاسکتی ہے جہاں نجاست کا اثر ظاہر نہ ہو۔۔۔ نجاست کے باب میں بھی اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ نجاست کی دو قسمیں ہیں: نمبر ۱، نجاست غلیظہ۔ نمبر ۲، نجاست خفیفہ۔

۔۔۔ مندرجہ ذیل نجاستیں، نجاست غلیظہ ہیں:

﴿۱﴾۔۔۔ آدمی کے بدن سے نکلی ہوئی ہر وہ چیز جس سے وضو یا غسل جاتا رہے۔

(تفصیل کتب فقہ میں مذکور ہے)

﴿۲﴾۔۔۔ ہر خشکی کے جانور کا بہتا ہوا خون، خواہ جانور حرام ہو یا حلال۔

﴿۳﴾۔۔۔ مردار کی چربی اور اس کا گوشت۔

﴿۴﴾۔۔۔ ہر حلال چوپائے کا پاخانہ۔

﴿۵﴾۔ گھوڑے کی لید۔

﴿۶﴾۔ جو پرند اونچا نہ اڑے: جیسے مرغی اور بطخ، خواہ چھوٹی ہو یا بڑی، ان سب کی بیٹ۔

﴿۷﴾۔ حرام چوپائے: جیسے کتا، بلی، شیر، چیتا، لومڑی، بھیڑیا، گیدڑ، گدھا، خچر، ہاتھی، سور، ان سب کا پیشاب، پاخانہ۔

﴿۸﴾۔ ہر قسم کی شراب اور نشہ والی تاثیر اور سیندھی۔

﴿۹﴾۔ سانپ کا پاخانہ و پیشاب اور اس جنگلی سانپ اور جنگلی مینڈک کا گوشت جن میں بہتا خون ہوتا ہے۔ اگر چہ ذبح کئے گئے ہوں۔ یوں ہی انکی کھال اگر چہ پکانی گئی ہو، یعنی مدیونہ کی گئی ہو۔

﴿۱۰﴾۔ سور کا گوشت، ہڈی، کھال اور بال۔ اگر چہ ذبح کیا گیا ہو۔

﴿۱۱﴾۔ ہاتھی کے سوئد کی رطوبت اور شیر، کتے، چیتے اور دوسرے درندے چوپائیوں کا لعاب

۔۔۔ مندرجہ ذیل چیزیں نجاست خفیفہ ہیں۔۔۔

﴿۱﴾۔ جن جانوروں کا گوشت حلال ہے ان کا پیشاب۔

﴿۲﴾۔ گھوڑے کا بھی پیشاب۔

﴿۳﴾۔ جن پرند کا گوشت حرام ہے (خواہ وہ شکاری ہو یا نہ ہو) جیسے کوا، چیل، شکر،

باز، بہری، ان سب کی بیٹ۔

﴿۴﴾۔ حرام جانوروں کا دودھ، گھوڑی کے دودھ کے سوا جو پاک ہے، لیکن کھانا جائز

نہیں۔ نجاست غلیظہ اگر کپڑے پر ایک درہم کی مقدار سے کم ہو تو اسکو پہن کر نماز ہو جائے

گی، گو خلاف سنت ہے۔ اور اگر ایک درہم کی مقدار میں ہو تو اس کا دھونا واجب ہے،

لہذا اس کو پہن کر نماز اگر پڑھی گئی تو پھر دوبارہ نماز لوٹانا واجب ہے۔ اور اگر ایک درہم

کی مقدار سے زیادہ ہو تو دھونا فرض ہے۔ بغیر دھوئے اگر اسی کو پہن کر نماز پڑھی تو نماز

نہ ہوگی۔۔۔ رہ گئی نجاست خفیفہ تو یہ کپڑے کے جس حصے میں لگے اگر اس حصے کی

کبھی ہماری مسجدوں کو آکر نہیں دیکھتا ورنہ اس پر ظاہر ہو جاتا کہ نمازیوں کی اکثریت غریبوں پر ہی مشتمل ہوتی ہے۔ خوشحال لوگ بہت کم نظر آتے ہیں۔ پتہ چلا، نہ خوشحالی نماز پڑھاتی ہے اور نہ غربت نماز سے روکتی ہے۔ جس کے دل میں خدا کا خوف اور اپنی بندگی کا احساس ہے، وہ کبھی نماز کو فراموش نہیں کر سکتا، خواہ امیر ہو یا غریب۔ اور جس کے دل میں یہ خوف و احساس نہ ہو، وہ ہمیشہ پہلو تہی کرتا نظر آئے گا، خواہ امیر ہو یا غریب۔ لہذا امارت و غربت کو اداۓ صلوٰۃ یا ترک صلوٰۃ کا معیار بنانا قطعاً صحیح نہیں۔

-- اب سائل کا تیسرا سوال ملاحظہ کیجئے:

’روزے میں سحر اور افطار کے درمیان کسی چیز کا کھانا یا پینا جائز نہیں ہے۔ اسکے معنی یہ ہے کہ روزے دار سحر کو خوب پیٹ بھر کے کھالے اور دن میں عبادت الہی میں مشغول رہے، تاکہ صبح معنوں میں روزہ ادا کر سکے اور پھر افطار کے وقت اس کیلئے تیار غذا موجود ہو۔ اب آپ غور کیجئے کہ اس صنعتی ترقی یافتہ دور میں غریب مزدور طبقہ کس طرح ان شرائط کو پورا کر سکتا ہے۔ انکو اپنی روٹی کے حصول کیلئے دن بھر سخت محنت کرنی پڑتی ہے اور اس دوران میں وہ بغیر کچھ کھائے پیئے اپنی توانائی باقی نہیں رکھ سکتا۔--

جواباً علماء یہ کہتے ہیں کہ اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں نے ’صائم‘ بانہا اور قائم باللیل‘ رہ کر بڑی بڑی لڑائیوں میں فتوحات حاصل کی ہیں۔ اسلئے اس دور میں بھی روزے کو محنت و جانفشانی کیلئے ایک بہانہ بنانا غلط بات ہے۔-- معترضین یہ کہتے ہیں کہ وہ قدیم دور مذہبی جذبات اور فتح و کامرانی کیلئے جدوجہد کا تھا۔ روزہ و عبادت مقابل کے مذہب والوں پر ایک اچھا اثر ڈالتے تھے۔ لیکن یہ دور عقل و فراست (Rationalism) کا ہے۔ نہ کسی کو کسی پر فتح حاصل کرنا ہے اور نہ کسی کو مرعوب کرنا ہے تو ایسی صورت میں روزہ ایک بے معنی سی چیز ہے۔ اگر اسلام اسکو باقی رکھنا چاہتا ہے تو صرف وہ لوگ اسکو

باقی رکھیں گے جو سرمایہ دار ہوں۔ جن کو دن میں دو مرتبہ پیٹ بھر کر کھانا ملتا ہے۔ گزارش ہے کہ اسکے جواب میں اولیاء اور صوفیاء کی مثالیں نہ دی جائیں۔

طلوع صبح صادق سے غروب آفتاب تک کسی چیز کے کھانے، پینے وغیرہ سے اپنے نفس کو روک رکھنے کا نام شرعی اصطلاح میں روزہ ہے۔ رہ گئے غروب آفتاب سے طلوع صبح تک کے اوقات، تو ان میں ہر شخص کو جائز چیز جائز مقدار میں کھانے پینے کی اجازت ہے۔ اور صرف یہی نہیں کہ اجازت ہے بلکہ کچھ نہ کچھ نا کھانا پینا بھی ممنوع ہے، یہاں تک کہ افطار نہ کرنا تو بڑی بات، اس میں تاخیر کرنا بھی شرعی نقطہ نظر سے غیر مستحب ہے۔ جو بھی میسر آئے، فوراً، غروب آفتاب کے بعد اس سے افطار کر لے، خواہ وہ پانی ہی کیوں نہ ہو۔

اسی طرح سحری کو بھی بہت ساری برکتوں کا سرچشمہ قرار دے کر بتا دیا گیا ہے کہ اس سے محرومی بہت ساری برکتوں سے محرومی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ افطار و سحری کسی میں بھی شرب و طعام کی کوئی مقدار متعین نہیں کی گئی ہے، کہ اس سے کم نہ ہو۔ یہ تو ہر شخص کے حالات پر ہے جس کو جتنا میسر آئے۔۔۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جن کو دن کے دو وقتوں کیلئے کھانا مل جاتا ہے، وہ اس کو رات کے دو وقتوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ وہ لوگ بھی جو دن میں صرف ایک وقت کے کھانے کا انتظام کر پاتے ہیں، اپنے دن کے وقت کے کھانے کو رات کے وقت کا کھانا بنا سکتے ہیں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر کسی کیلئے دن کے صرف ایک وقت کا کھانا اس کیلئے کسی نہ کسی درجہ میں اتنی طاقت و توانائی کا باعث ہو سکتا ہے، جس سے وہ دنیاوی کاروبار چلا سکے، محنت و مزدوری کر سکے، تو اس کیلئے اسی مقدار میں رات کے ایک وقت کا کھانا اسی طاقت و توانائی کا سبب ہوگا۔۔۔ یہی حال انکا بھی ہے جو دن میں دو بار کھاتے ہیں کہ جب دن کا دو بار کھانا ان کی محنت و مشقت کیلئے ان کو معتد بہ قوت بخش دیتا ہے، تو یہی کھانا اگر رات کے دو وقتوں میں کھایا جائے،

جب بھی وہی طاقت میسر آئے گی۔۔۔ الحاصل۔۔۔ ایک شخص جس قسم کی جتنی غذاؤں کو دن میں اپنے بدن میں پہنچا سکنے کی قدرت رکھتا ہے، اسی قسم کی وہ اتنی ہی غذاؤں کو بھی مختلف اوقات میں بدن کو دے سکتا ہے۔

اس مختصری تمہید نے یہ بات واضح کر دی کہ سائل کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ روزہ وہی رکھ سکتا ہے جسے دوسرے پیٹ بھر کر کھانا ملتا ہو۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ غرباء مسلمین زیادہ تر روزے دار نظر آتے ہیں یہ خلاف خوشحال حضرات کے۔ غریب کو تو فاقہ کی کسی حد تک عادت ہو جاتی ہے، لیکن خوشحال فاقہ سے کم آشنا ہوتے ہیں۔ روزہ دراصل غریبوں کا نہیں، خوشحالوں کا امتحان ہے۔ پھر پرسونے والے کو پتھر پر سلایا جائے تو کون سی آزمائش ہوئی؟ ہاں اگر کسی قالین و مخمل پر سونے والے کو پتھر پر سلا دیجئے پھر اسکی کروٹوں کو شمار کیجئے۔ نیند تو بڑی بات، جھپکی تک نہیں آ سکتی۔

معلوم ہوا کہ اس مقام پر بھی 'ترکِ صوم' و 'ادائے صوم' کا معیار غربت و امارت کو ٹھہرانا بڑی کوتاہ نظری کی بات ہے۔ یہاں بھی ان دونوں کی اساس اسی خوف و احساس کے عدم وجود پر ہے۔ جس کی طرف دوسرے سوال کے جواب میں اشارہ گذر چکا ہے۔

سائل کے سوال سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے عبادتِ الہی کے وسیع مفہوم کو نہیں سمجھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ سائل کے نزدیک، عبادتِ الہی صرف گوشوں میں بیٹھ کر تسبیح و تہلیل کرنے اور الگ تھلگ فرائض، نیز نوافل پر نوافل پڑھنے کا نام ہے۔ حالانکہ یہ امور عبادت کے وسیع ترین مفہوم کا ایک حصہ ہیں۔۔۔ اسلام کے نزدیک ہر وہ کام عبادتِ الہی ہے جسے خدا و رسول کے بنائے ہوئے قانون کے تحت انجام دیا جائے۔ اسی لئے مومن کا کھانا، پینا، چلنا، پھرنا، سونا، جاگنا، روزی کمانے کیلئے محنت و مشقت کرنا، بچوں سے پیار کرنا، ازواج سے محبت کرنا، والدین کی عزت کرنا، ہمسائے

کا خیال رکھنا، ان سب کے حقوق کا لحاظ رکھنا، وغیرہ وغیرہ۔۔۔ یہ تمام چیزیں عبادتِ الہی ہیں، بشرطیکہ قوانینِ اسلامی کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ امور انجام دیئے جائیں۔

۔۔۔ الحاصل۔۔۔ مومن کی زندگی کا ہر وہ لمحہ، جو خدا کے قانون سے غافل نہیں

ہونے ویتا، عبادت ہے۔ خواہ وہ مومن مسجد میں ہو یا خانقاہ میں، بازار کے ہنگاموں میں ہو یا مشینوں کی گہما گہمی میں ہو۔۔۔ ترک و نیا یہ نہیں کہ دنیا سے الگ ہو جاؤ، ترک و نیا یہ ہے کہ دنیا میں رہو لیکن خالق و نیا سے غافل نہ ہو جاؤ۔

اس وسیع مفہوم کو سامنے رکھنے والے پر یہ بات واضح ہے کہ روزہ دار دنیا کے تمام کاروبار میں رہ کر بھی عبادتِ الہی سے الگ نہیں رہ سکتا۔ اس کا ہر لمحہ عبادتِ الہی میں مشغول ہے، بشرطیکہ وہ قانونِ اسلامی کا عملاً احترام کرتا رہے اور وہی کام کرے تاہم شرعی جس کی پشت پناہ ہو۔ جب یہ صورت ہے تو اس کا روزہ صحیح معنوں میں روزہ اور وہ صحیح معنوں میں روزہ دار ہے۔ خواہ وہ تسبیح و تہلیل اور دیگر نوافل کی سمجھی بوجھی صورت کو اپنائے یا نہ اپنائے۔ نیز گوشہ نشینی و عزلت گزینی اختیار کرے یا نہ کرے۔۔۔

بیشک افطار کے وقت افطار کیلئے حسب استطاعت چیز کی موجودگی درکار ہے مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس چیز کے مہیا کرنے کیلئے دن کے اوقات کی ساری جائز کوششیں عبادتِ الہی ہی ہیں۔

سائل نے معترضین کی طرف سے اس حقیقت کا اعتراف کر لیا ہے کہ:

’قدیم دور مذہبی جذبات اور فتح و کامرانی کی جدوجہد کا تھا۔ روزہ و عبادت مقابل کے مذہب والوں پر ایک اچھا اثر ڈالتے تھے۔۔۔‘

حیرت ہے کہ اس اعتراف کے بعد، نیز عبادت کی اس اثر اندازی کو تسلیم کر لینے کے بعد، سائل اس کی ضرورت کا منکر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سائل اسلام کو فقط ایک مذہب اور دھرم سے زیادہ نہیں سمجھتا۔ حالانکہ اسلام ایک کامل دین اور مکمل

دستور حیات ہے۔ جس میں دنیا و آخرت کی زندگی کا کوئی ایسا معمولی سا بھی گوشہ نہیں جس کیلئے روشنی نہ ملتی ہو۔ اسلام دوسرے مذاہب اور دھرموں کی طرح نہیں جو اپنی مخصوص عبادت گاہوں کی چہار دیواری تک محدود ہیں۔ اور اس چہار دیواری کے باہر اپنے ماننے والوں کو پوری آزادی دے کر خود دامن جھاڑ کر الگ ہو جاتے ہیں۔ اسلام مذہب و سیاست میں ایک ایسا حسین امتزاج پیش کرتا ہے، نیز دنیا و آخرت کو ایسا مربوط کر دیتا ہے کہ انسان کی زندگی کا کوئی لمحہ اس کی ہدایتوں سے خالی نہیں۔ اس کا قانون اگر ایک زہد شب زندہ دار کیلئے ہے تو اسی طرح میدان جنگ میں لڑنے والے سپاہی کیلئے بھی ہے۔

۔۔۔ الحاصل۔۔۔ اسلام نے انسانوں کو انکی ملکی، شہری، اجتماعی، انفرادی، و اخلاقی، خارجی، دینی، و اخروی، وغیرہ کسی زندگی میں بھی انھیں مطلق العنان نہیں کیا ہے بلکہ انسانی حیات کے ہر شعبہ کیلئے اسلام مینار ہدایت رہا ہے۔ اس یقین و اذعان کے ساتھ کہ اسی کا بتایا ہوا راستہ صحیح و سالم اور انسان کو اس کی دنیا و آخرت کی ہر زندگی میں نجات کی طرف لیجانے والا راستہ ہے۔ اسکے سوا سارے راستے ہلاکت کی طرف لیجاتے ہیں۔۔۔ تو جس طرح پہلے دور میں ضرورت تھی کہ اسلام کے پاکیزہ اصولوں کا اسلام کے بتائے ہوئے طریقہ سے انسانی دل و دماغ پر اثر ڈالا جائے اور انکے دل و دماغ کی سرزمین سے انکے خود ساختہ، ہلاکت کی طرف لیجانے والے مذہبوں اور دھرموں کی بنیادیں اکھاڑ پھینکی جائیں اور وہاں پر اسلامی ضابطہ حیات کا تسلط جما کر اسلام کی فتح و کامرانی کا پرچم اہرایا جائے۔۔۔ اسی طرح اس دور میں بھی اسکی ضرورت ہے کہ انسان کے دل و دماغ سے باطل اصولوں کے پرچم کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے سرنگوں کر کے وہاں اسلامی قوانین کے علم کو نصب کیا جائے اور جس طرح اس دور میں اسکی ضرورت ہے اسی طرح آنے والے دور میں بھی اسکی حاجت رہے گی۔ اور جب تک

اسکی ضرورت رہے گی، مسلمانوں کی جدوجہد بھی ہوتی رہے گی۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہی تو کہیں گے کہ آج تیر و تیر اور سیف و سنان کا زمانہ نہیں، لیکن نوکِ قلم اور سیفِ زبان کا زمانہ تو نہیں ختم ہوا۔۔۔

۔۔۔ الحاصل۔۔۔ قدیم دور بھی اسلام کی فتح و کامرانی کیلئے جدوجہد کا دور تھا۔ اور یہ موجودہ دور بھی، نیز آنے والا دور بھی۔۔۔ یوں ہی جس طرح قدیم دور مذہبی جذبات کا دور تھا، اسی طرح آج کا بھی دور مذہبی جذبات کا دور ہے۔ اور ہر دور مذہبی جذبات کا دور رہے گا۔ مذہب انسان کی فطرت ہے۔ جب تک انسان اپنے فطری تقاضوں کو ملحوظ رکھے گا، مذہبی جذبات کا فقدان نہیں ہو سکتا۔ انسان کی فطرت ہی تو ہے جس نے انسانوں کی ایک بڑی اکثریت کو کسی نہ کسی مذہب کا پابند بنا رکھا ہے۔ رہ گیا اس بڑی اکثریت کے مقابلہ میں چند افراد کا لامذہب ہونا، تو یہ اس بات کا مقتضی نہیں ہے کہ مذہب انسان کی فطرت نہ ہو۔ جس طرح انسانوں کی ایک بڑی اکثریت کے مقابلہ میں چند خنثیوں یا راہبوں کا وجود اس بات کی دلیل نہیں کہ خواہشات نفسانی انسان کی فطرت نہیں۔۔۔ کسی چیز کا فطرت انسانی ہونا اور ہے اور کسی فطرت انسانی کا خارجی عوارض و علل کے تحت مردہ و بے جان ہونا اور ہے۔۔۔

یہ ساری گفتگو سائل کے اس مفروضے کی بنیاد پر ہے کہ روزہ کی فرضیت دوسروں پر اثر اندازی کیلئے ہے۔ حالانکہ روزہ اور اسی طرح دوسری عبادتوں کی فرضیت کا صحیح مقصد خود اپنی ذات کی اصلاح اور ہر لمحہ اپنی عبدیت کے تقاضے، نیز خدا اور بندے کے درمیانی تعلق کے احساس کو بیدار رکھنا ہے۔۔۔ اب اگر اس سے کوئی دوسرا بھی متاثر ہو جائے تو یہ ایک دوسری چیز ہے اسے فرضیت کی علت نہیں قرار دیا جاسکتا۔ زیادہ سے زیادہ اس کو نکتہ بعد الوقوع کی حیثیت دی جاسکتی ہے۔ روزہ، نیز دوسری عبادتوں کی اس صحیح علت کو سمجھنے کے بعد اب سائل خود سوچے کہ ان عبادتوں سے صرف

نظر کرنا اپنے کو کتنی بڑی تباہی کی نذر کرنا ہے۔ اسلامی احکامات کی علت اپنی طرف سے فرض کر کے اس پر کسی اعتراض کی بنیاد رکھنا، جیسا کہ سائل نے کیا ہے، انصاف و دیانت کا خون کرنا ہے۔۔۔

سائل کو سوچنا چاہئے کہ روزہ جہاں ضبط نفس کا اعلیٰ کردار پیش کرتا ہے وہیں وہ اپنی بعض خصوصیتوں کے سبب دوسری عبادتوں میں انفرادی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ روزہ ہی ایک ایسی عبادت ہے جو خالصاً ’لوجہ اللہ‘ ہی ہو سکتی ہے۔ اسلئے کہ اس میں ریا کا کوئی دخل نہیں۔ ریا ان اعمال سے متعلق ہو سکتی ہے جن کا صدور ظاہری اعضاء و جوارح سے ہوتا ہے لیکن روزہ تو ترک عمل کا نام ہے پھر اس میں ریا کا کیا دخل۔ لہذا اپنے معبود ہی کی رضا و خوشنودی جس کی متاع حیات ہے روزہ دار وہی ہو سکتا ہے۔

موجودہ دور کو عقل و فراست کا دور کہنا اور گزشتہ دور کو جہالت و سفاہت کا دور سمجھنا تباہی ہے کہ سائل نے ابھی عقل و فراست ہی کو نہیں سمجھا اور نہ ہی اسکے ذہن میں جہالت و سفاہت ہی کا کوئی مفہوم ہے۔ کیا سائل اس بات پر غور کرنے کی زحمت گوارہ کرے گا کہ اس سائنٹفک دور میں جبکہ ہر طرف مشینوں کا تسلط ہے، کالجوں اور یونیورسٹیوں کا جال پھیلا ہوا ہے، کیا کہیں سقراط، بقراط، جالینوس، افلاطون، فیسا غورث، بطلموس، دیمقراطیس، ارسطو، فارابی، بوعلی سینا، وغیرہ نظر آرہے ہیں؟ آج کل کی تعلیم گاہیں ایسے افراد کو نکالنے سے کیوں عاجز ہیں؟ اب تو جگہ جگہ ایسے لوگ آنے چاہئیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اُنکے دور کو عقل و فراست کا دور کہوں، یا آج کے اس دور کو جس میں انہیں کُچپائے ہوئے لقموں پر سب کی تحقیق و تدقیق کی اساس ہے اور انہی کے بنائے ہوئے اصول ساری سائنٹفک ترقیوں کی بنیاد ہیں۔

میں نے اس مقام پر علمائے یونان کے اسماء خاص طور پر اس لئے تحریر کئے ہیں تاکہ سائنس زدہ حضرات عبرت حاصل کریں کہ ان کے پہلے جس منزل تک پہنچ

چکے ہیں ابھی انھیں وہاں کی ہوا تک نہیں لگی ہے۔۔۔ حکمائے یونان کے علاوہ حکمائے اسلام کی ایک طویل فہرست بھی میری نگاہوں میں ہے جن میں کاہر ایک اپنے دور میں فہم و فراست کا جبل عظیم تھا۔ جنھوں نے حکمائے یونان کی عقل و فراست کے آگے سر جھکانے کے بجائے نظری و فکری طور پر اُن کے سروں کو اپنے آگے جھکا لیا۔ صرف یہی نہیں، بلکہ فکر و نظر کی ایک ایسی شاہراہ بنادی جس پر چل کر ہر انسان چرخ فہم و فراست کے ستاروں کا مرکز نگاہ بن جاتا ہے۔ کیا سائل کوئی ایسی لکیر کھینچ سکتا ہے جو یہ ظاہر کرے کہ اس سے پہلے والے جہالت و سفاہت کے ہیں، اور اس کے بعد والے، عقل و فراست کے۔۔۔ اگر سائل ایسا خط امتیاز کھینچنے سے عاجز ہے تو اسے کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ فہم و فراست کو کسی دور کے ساتھ خاص کرے۔۔۔ ارتقاء انسانی کے فلسفے سے جو باخبر ہیں ان پر یہ حقیقت واضح ہے کہ انسان کی بتدریج ساری تر قیاں فہم و فراست ہی کی مرہون منت ہیں۔ جس دور میں جس فہم و فراست کی ضرورت تھی، قدرت کاملہ کی منت قدیم اس دور کے انسانوں کو اس سے نوازتی رہی اور وہی فہم و فراست انسانی فلسفہ ارتقاء کی ایک کڑی بن گئی۔۔۔ سائل کی یہ بات بھی بڑی دلچسپ ہے کہ:

’اسکے جواب میں اولیاء اور صوفیاء کی مثالیں نہ دی جائیں‘

۔۔۔ معلوم ہوتا ہے کہ سائل کو اس بات کا پورا اعتراف ہے کہ انسانی افراد میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جنھیں اولیاء و صوفیاء کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جن کی پوری زندگی کے ہر گوشے پر اخلاقی قدروں اور مذہبی جذبات کا ایسا تسلط ہے کہ وہ کڑی سے کڑی منزل میں بھی احکامات اسلامیہ کی ادائیگی میں کچھ بھی دشواری محسوس نہیں کرتے۔ درحقیقت یہی لوگ اسلام کے سچے وفادار ہیں لہذا اگر ان کو صفحات تاریخ سے نکال دیا جائے، تو پھر اسلام میں دنیا کے آگے پیش کرنے کیلئے کون سی چیز رہ جاتی ہے۔ ہر اصول کی صداقت اسکے سچے وفاداروں کی کامیابی سے پہچانی جاتی ہے۔ لہذا اسلام کو

سمجھانے کیلئے اگر اسکے سچے وفاداروں کی مثال نہ دی جائے تو پھر کس کی مثال دی جائے؟۔۔۔ نیز۔۔۔ اسی جملہ سے سائل کے اس اعتراف کی بھی نشاندہی ہوتی ہے کہ یہ مقدس ہمتیاں اس دور میں بھی ہیں اور ہر دور میں رہی ہیں۔ ان کا وجود قرونِ اولیٰ کے خصوصیات سے نہیں، ورنہ سائل یوں کہتا کہ:

’اس کے جواب میں صحابہ و تابعین کی مثالیں نہ دی جائیں‘

۔۔۔ سائل نے اسلئے بھی کہا کہ وہ اس تاریخی حقیقت سے باخبر ہے کہ صحابہ و تابعین سے اگر صرف نظر کر لیا جائے جب بھی انکے بعد کے ہر دور میں، حتیٰ کہ اس موجودہ دور میں بھی ایسے کثیر افراد کو سامنے لایا جاسکتا ہے جو خود سائل کی نگاہ میں عظیم کردار کے مالک ہیں۔ جن کے نزدیک احکاماتِ اسلامیہ پر عمل ایک آسان ترین چیز ہے۔۔۔ ایسے افراد کا وجود کیا اس حقیقت کو واضح نہیں کرتا کہ احکاماتِ اسلامیہ کی بجا آوری میں سائل کو جو دشواری معلوم ہو رہی ہے، وہ محض خیالی ہے۔ حقیقت سے اس کو دور کا لگاؤ نہیں۔ ورنہ کیسے ممکن تھا کہ شاہراہِ اسلام پر یہ نفوسِ قدسیہ ہنستے مسکراتے گزرتے چلے جائیں اور کہیں ایک ٹھوکر کا بھی احساس نہ ہو۔۔۔

ان افرادِ انسانی کا وجود یہ بھی بتا رہا ہے کہ ابھی مذہبی جذبات کے زمانے کا فقدان نہیں ہوا۔ سائل نے یہ نہیں غور کیا کہ جسے وہ صوفی یا ولی کہہ رہا ہے، وہ انسانوں کے سوا کوئی دوسری مخلوق نہیں۔ وہ بھی انسان ہی ہیں اور جملہ خواہشاتِ انسانیہ کے حامل ہیں لیکن انھوں نے پر خلوص ایمان کے ساتھ احکاماتِ اسلامیہ پر عمل کو اپنی زندگی کا جزو بنالیا اور زندگی کے جملہ ہنگامہائے شوق اور کائنات کی گہما گہمی میں اپنے کو الجھا کر بھی اپنے خدا سے غافل نہ رہے۔۔۔ الحاصل۔۔۔ دنیا میں رہے لیکن دنیا کے نہ رہے۔۔۔ لہذا۔۔۔ ایمان و عمل کے پر خلوص امتزاج کا جو لازمی ثمرہ تھا اس سے ان کا دامنِ مراد کبھی خالی نہ رہا۔۔۔ غور فرمائیے آج ایک انسان، تہی دامن انسان، عام انسانوں

جیسا انسان، بلکہ کفر و شرک میں آلودہ انسان، ضلالتوں، گمراہیوں میں گھرا ہوا انسان اگر تائب ہو کر اسلام کا سچا و فادار بن جاتا ہے اور پورے خلوص کے ساتھ اسکے جملہ فرامین ایمانیہ اور احکامات عملیہ کو اپنی زندگی کا 'جز و لا ینفک' بنا لیتا ہے اور دنیا اسے صوفی، ولی، مومن کامل جیسے الفاظ سے یاد کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے، تو پھر دوسرے انسانوں کیلئے فوز و کامرانی کے اس مقدس دروازے کو بند کر دینے کی کوشش کرنا، کیا معنی رکھتا ہے۔۔۔

اسلام کی جملہ تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر انسان اپنے پیدا کرنے والے کا سچا و فادار، بہ لفظ مختصر، مومن کامل ہو جائے اور ایمان کا کمال اعمال سے روگردانی کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا۔ ایسی صورت میں چاہئے تو یہ تھا کہ، انسان اسلام کی مکمل دعوت کو اپنا کر اپنے ہر کردار کو اس کی ہدایت کے مطابق بنا لے۔ لیکن ہو یہ رہا ہے کہ سرکش انسان اسلام کو اپنے کردار کے مطابق بنانا چاہتا ہے اور اپنی بے عملی اور زبوں کرداری کا جواز تلاش کر رہا ہے اور وہ بھی بار بار اور مسلسل اس تجربہ کے بعد کہ اسلام کی بنائی ہوئی شاہراہ پر جو چلا وہ یقینی طور پر کامیاب ہوا اور ہو رہا ہے۔ تاریخ کوئی ایسی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے جس میں اسلام کی سچی وفاداری کسی انسان کے حقیقی خسارے اور گھٹائے کا سبب بن گئی ہو۔ آج مسلمانوں کی ناگفتہ بہ حالت اس وجہ سے نہیں ہے کہ وہ دین اسلام کو مانتے ہیں بلکہ اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ وہ اسلام کو اپنا کر بھی اس کے سچے وفادار اپنے کو بنانے کی کوشش نہیں کرتے۔ ان کی سہل پسندی کی زبان حال کہتی ہوئی نظر آتی ہے کہ وہ اسلام کے ایسے قانون نکال دینے کی آرزو رکھتے ہیں جو ان سے ایثار و قربانی اور ریاضت و مجاہدہ چاہتے ہیں۔۔۔۔۔

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا

کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

غور فرمائیے، وہ کون سا دستور ہے اور وہ کون سا ضابطہ ہے جو اپنے ماننے والوں کی وفاداری نہ چاہتا ہو، تو پھر اگر اسلام اپنے ماننے والوں سے وفاداری کا مطالبہ کر رہا ہے تو کون سا غیر فطری مطالبہ ہے۔ سچا وفادار ہوئے بغیر کسی دستور کے لازمی ثمرات کی توقع رکھنی کس قدر مہمل اور بے جان سی بات ہے۔

اگر اس قسم کے سوالات کو نگاہ استحسان سے دیکھا گیا تو کیا عجب ہے کہ ایک چور سوال کر دے کہ آج ہر طرف مفلوک الحالی کا دور دورہ ہے، انسانوں کی ایک کثیر جماعت غربت کا شکار نظر آرہی ہے، ایسی حالت میں غریبوں کیلئے ناگزیر ہو گیا ہے کہ وہ چوری کریں۔ لہذا اگر کسی دین میں چوری کو برا کہا گیا ہے اور بڑی شد و مد سے اس کی ممانعت کی گئی ہے، نیز چوری کیلئے حد مقرر کر دی گئی ہے تو وہ دین موجودہ دور کے مطابق نہیں اور اس دور میں چوروں کیلئے ادنیٰ سزا بھی، چہ جائیکہ ”قطعید“ ایک بے معنی سا قانون ہے، جس کو تسلیم کرنا دشوار ترین امر ہے۔ ایسے اصول کو وہی مان سکتے ہیں جو دولت مند اور خوش حال ہیں۔ بے چارہ وہ غریب کیسے مان سکتا ہے جس کے آگے پیچھے کوئی سہارا نہیں۔ گزارش ہے کہ اسکے جواب میں ان لوگوں کی مثالیں نہ دی جائیں جو غریب رہ کر بھی دیانتدار اور ظالمانہ تصرف سے دور ہیں۔۔۔ یا۔۔۔ کوئی شرابی کہہ اٹھے۔۔۔ یہ دور غم و الم اور رنج و محن کا دور ہے، بالخصوص غریب مزدور طبقہ نہ جانے کتنے غم و آلام کا شکار ہے، اور شراب غم غلط کرنے کا ایک اچھا اور کامیاب ذریعہ ہے۔ لہذا اس دور میں شراب حرام کرنے کا قانون ایک بے معنی قانون ہے جس کا موجودہ دور کے غم کے ماروں کو تسلیم کر لینا ناممکن ہے۔ اس قانون کو وہی مان سکتے ہیں جن کے سر پر کوئی غم ہی نہ ہو۔ گزارش ہے کہ اس کے جواب میں ان لوگوں کی مثالیں نہ دی جائیں جو میدان تسلیم و رضا کے ایسے شہسوار ہیں کہ غم و آلام میں بھی مسکراتے ہیں۔۔۔ یا۔۔۔ کوئی بدکردار بول پڑے۔۔۔ اس غربت و افلاس کے دور

میں جبکہ ایک روٹی کا ٹکڑا حاصل کرنے میں نہ جانے کتنے پاڑ بیلنے پڑتے ہیں، بیچارے غریب مفلس انسان میں اتنی سکت کہاں ہے کہ وہ اپنی شادی کر کے خانہ آبادی کر سکے اور ایک دوسرے نفر کا ذمہ بھی اپنے سر لے لے۔ دوسری طرف خواہشاتِ نفسانیہ بھی اس کے دامن کو نہیں چھوڑ رہی ہیں۔ ایسی صورت میں وہ دین کیسے مان لینے کے لائق ہو سکتا ہے، جہاں تکمیلِ خواہشات کے بہیمانہ طرزِ عمل کے خلاف بڑی بڑی حدیں مقرر ہوں۔ گزارش ہے کہ اسکے جواب میں ان لوگوں کی مثالیں نہ پیش کی جائیں جو اپنے کو مقامِ انسانیت سے گرانے کو تیار نہیں اور دل میں خدا کا خوف رکھتے ہیں۔۔۔ وغیرہ۔۔۔ وغیرہ۔

غور فرمائیے! یہ سوالات ہیں یا اخلاقی قدروں کے جنازے؟ ان سوالات کے پردے سے جو ذہنیت جھانک رہی ہے وہ انسان کو کہاں لے جانا چاہتی ہے؟ انسانیت دشمنی کی اس سے بدترین صورت اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایسی فضا ہموار کی جائے جس میں انسان بہیمانہ طرزِ زندگی کو اپنا کر بھی اپنے کو انسان سمجھے۔۔۔ کچھ اسی سے ملتا جلتا رنگ ہے، سائل کے سوال کا، جہاں اخلاقی قدروں کے فقدان کیلئے قانون و اصول کی اختراع کرنے کی کوشش ملتی ہے۔ ان تمام سوالات کو دوبارہ غور سے ملاحظہ فرمائیے۔ ہر سوال کا آخری جملہ جس کا آغاز گزارش ہے سے کیا گیا ہے، اپنے اجمال میں اس سوال کا مکمل جواب لئے ہوئے ہے۔ ان سوالوں کے ان آخری جملوں میں جن کا استثناء کیا گیا ہے، کیا ان کا وجود اس بات کی دلیل نہیں کہ سائل جن امور کو اپنی قلبی کجی کے سبب ناممکن العمل سمجھ رہا ہے، درحقیقت ان پر عمل دشوار نہیں اور سائل کے یہ سوالات معقولیت کے بجائے نفسانیت پر مبنی ہیں۔

غور فرمائیے! اگر ساری دنیا سے دیانتداروں، تسلیم و رضا کے شہسواروں اور خدا سے ڈرنے والوں کو الگ کر دیا جائے تو پھر عالمِ انسانیت میں انسان نما درندوں

اور ان کی درندگی کے سوا کیا رہ جائے گا۔ تو بھلا بتائیے، انسانیت کو سمجھانے کیلئے اگر انسانوں کی مثالیں نہ دی جائیں تو کیا درندوں اور دو ٹانگ کے جانوروں کی مثالیں پیش کی جائیں۔۔۔ ان تفصیلات کو سامنے رکھنے کے بعد اس جواب کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، جو علماء نے دیا ہے کہ:

’اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں نے ’صائم بالنہار‘ اور ’قائم باللیل‘ رہ کر بڑی بڑی لڑائیوں میں فتوحات حاصل کی ہیں۔ اسلئے اس دور میں بھی محنت و جانفشانی کو ترک صوم کیلئے ایک بہانہ بنانا ایک غلط بات ہے۔‘

میں نے یہ جواب سائل ہی کے پیش کردہ سوال سے ذرا سی لفظی و معنوی ترمیم کرتے ہوئے نقل کیا ہے۔ اسلئے کہ سائل کے الفاظ علماء کے ان جوابی خیالات کی ترجمانی نہیں کرتے جو خود سائل ان کی طرف سے پیش کرنا چاہتا ہے۔۔۔ اس مبلغ علم و ادب پر اسلام کے اصولوں پر اعتراض کرنے کا حوصلہ بھی عجب العجائب سے کم نہیں۔۔۔ اچھا اب آئیے سائل کا چوتھا سوال ملاحظہ فرمائیے:

’زکوٰۃ صاحب نصاب پر فرض ہے یعنی ہر متمول کو یہ حق دیا گیا ہے کہ محتاجوں پر اپنی خیر و خیرات سے اثر جمائیں، ہو سکتا ہے اسلامی اسپرٹ تمول کی مساوی تقسیم پر منتج ہو جیسا کہ خلفائے راشدین کے دور میں رہا ہے۔ اس میں سب سے اہم چیز بیت المال کا قیام ہے جس میں دینے اور لینے والے پر ایک حجاب باقی رہتا ہے۔ اور یہ بڑی حد تک کیونرم کے نظریہ سے مطابقت رکھتا ہے لیکن علمائے کرام نے انفرادی زکوٰۃ کے جواز سے اس اسلامی اسپرٹ کا خاتمہ کر دیا اور ہر صاحب نصاب یہ توقع رکھتا ہے کہ اس سے زکوٰۃ حاصل کرنے والے افراد اور ادارے اس کے مرہون منت رہیں۔ کیا اس طرح زکوٰۃ تمول پرستی کا سبق نہیں دیتی؟‘

یہ حقیقت ایک ادنیٰ فہم و فراست کے انسان پر بخوبی واضح ہے کہ قانون

جو خرچ کریں اپنے مال کو اللہ کی راہ میں، پھر نہ پیچھا کریں۔ کا جو خرچ کیا احسان جتنا کر اور نہ کھو۔ نہ کوئی کیلئے اجر ہے انکے رب کے پاس، اور نہ ان پر کوئی خوف اور نہ رنجیدہ ہوں۔

-- معلوم ہوا مسلمان زکوٰۃ دیتا ہے، خواہ کسی ایک فرد کو یا ادارے کو یا بیت المال کو، اس کا نفاذ احسان جتنا ہے اور نہ اثر جتنا، بلکہ اس کا اپنے اس عمل سے صرف اپنے رب کی رضا مقصود ہے۔ اسلئے خیر و خیرات میں ایسے اخفاء کہ دائیں سے دیں تو بائیں کو خبر نہ ہو، اسلامی نقطہ نظر سے محبوب ترین عمل ہے۔ زکوٰۃ دیتے وقت بھی صرف دل میں نیت کافی ہے۔ زبان سے اظہار نہ کرنا چاہئے، تاکہ لینے والے کو طبعاً سبکی یا

پیشمانی نہ محسوس ہو اور اگر بالفرض رضائے الہی کے سوا زکوٰۃ دینے سے کوئی اپنا اور مقصود بنالے تو اس کا الزام قانونِ زکوٰۃ پر نہیں، بلکہ خود اس فرد کے اوپر ہے جو اسلامی اسپرٹ کے فقدان کے سبب اسلامی تعلیم کے خلاف قدم اٹھا رہا ہے۔ زکوٰۃ فرض فرمانے والے اسلام نے، کیا احسان جتانے والوں کی زبانوں پر قفل نہیں چڑھا دیا؟ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ کسی دستور کی ایک دفعہ پر اسکی دوسری دفعات سے صرف نظر کر کے اعتراض کیا جائے۔

اس مختصر جواب سے سائل پر روشن ہو گیا ہوگا کہ اس کا سوال اسلامی قوانین سے نہ واقفیت اور اسلامی اسپرٹ سے بے خبری پر مبنی ہے۔ جس اسلام نے سارے انسانوں کے 'تفوق و تعالیٰ'، 'ترفع و کبریائی' کے دروازے کو بند کر کے صرف خدا کی کبریائی کے آگے سب کو جھکا دینے کو اپنے پورے اخلاقی جواہر پاروں کا مقصود نظر بتایا ہو، اس پر یہ بہتان کتنا عظیم بہتان ہے کہ وہ لوگوں سے دوسرے لوگوں کی کبریائی تسلیم کرانا چاہتا ہے۔ کیا سائل کو یہ خبر نہیں ہے کہ کسی دستور کے ماننے والوں کی بے راہ روی اور ہے، اور کسی دستور کی بے راہ روی اور۔ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ کسی فرد کی اپنی غلطی کو اسکے دین کے سر تھو پنا ایسا ہی ہے جیسے کہ کسی چور، شرابی، بدکار، کمیونسٹ کو دیکھ کر کمیونزم کو چوری، شراب خوری، زبوں کرداری، بدکاری، سکھانے والا ازم کہہ دیا جائے۔۔۔ جب آپ اسلام پر اعتراض کرنے چلیں ہیں تو اسلام کا گہرا مطالعہ کیجئے۔ اس کے قوانین کو سامنے لائیے اور پھر تابِ سخن ہو تو کچھ عرض کیجئے۔ مسلمانوں اور وہ بھی موجودہ دور کے مسلمانوں کے احوال دیکھ کر اسلام پر اعتراض کیا معنی رکھتا ہے۔ آپ مسلمان کو اسلام کا پابند سمجھتے ہیں یا اسلام کو مسلمان کا؟۔۔۔ اسلام کو سمجھنے کیلئے صحیح ترین صورت یہ ہے کہ قرآن وحدیث کا گہرا مطالعہ کیا جائے۔۔۔ یا۔۔۔ ان ہستیوں کے لیل و نہار کا جائزہ لیا جائے جنکی زندگی کا ہر لمحہ اسلام کی سچی وفاداری

میں گذرا۔۔۔ سائل نے غور نہیں کیا کہ اسلام نے غریبوں کے حقوق کو سرمایا داروں کے سر پر مسلط کر کے جہاں غربا پروری کو ایک لازمی امر اور اسلامیت کا مقتضاء قرار دیا ہے، وہیں زکوٰۃ دینے والوں کے قلوب کو ایک بہت بڑے مرض یعنی بخل سے نجات دیکر محلی و مصفیٰ کر دیا ہے۔۔۔ نیز۔۔۔ دنیا کو اس فلسفہ سے آگاہ کر دیا کہ دولت کی حرکت میں جو برکت ہے وہ اس کے جمود و قفل میں نہیں۔

رہ گیا سائل کا یہ گمان کہ 'قانون زکوٰۃ سے اسلام دولت کی مساوی تقسیم چاہتا ہے'، اسلامی فقہ کو نا سمجھنے پر مبنی ہے۔ اس لئے کہ دولت کی مساوی تقسیم کیلئے ہر دور میں بیت المال کا قیام لازمی ہے اور یہ بھی لازمی کہ اپنی دولت کے صرف چالیسویں حصہ کا نہیں بلکہ پورے دولت کا اسٹیٹ کو مالک بنا کر اسے بیت المال کے سپرد کر دیں اور وہ اسٹیٹ اپنے اندر بسنے والوں کا اعداد و شمار کر کے جتنی دولت مناسب سمجھے، سب میں برابر تقسیم کر دے اور یہ نہ دیکھے کہ راعی کون ہے اور رعایا کون۔ سپہ سالار کون ہے، سپاہی کون۔ ایک معمولی ٹیچر کون ہے اور ایک لائق پرفیسر کون۔ مزدور کون ہے، معمار کون، وغیرہ وغیرہ۔۔۔ الحاصل۔۔۔ سب دھان بائیں ۲ پنسیر ی بلفظ دیگر، 'اندھیر نگری چو پٹ راجہ، نکلے سیر بھاجی نکلے سیر کھا جا'۔۔۔ انسانی ضمیر میں صلاحیت و استعداد کی جو فطری تفریق ہے، اس کا کوئی لحاظ نہ ہو۔ بس اسٹیٹ مختار مطلق ہو اور اسٹیٹ کے بیت المال کو بھرنے والے 'مجبور محض'۔۔۔ دیکھا آپ نے دولت کی یہ اشتراکی مساویانہ تقسیم کس قدر غیر فطری قانون کی تشکیل چاہتی ہے۔

اسلام جو دین فطرت ہے بھلا اس کا کوئی قانون ایسا ہو سکتا ہے جو انسان کی فطرت کے خلاف ہو؟ اس لئے اسلام نے عثمان غنی اور دوسرے متمول صحابہ کی دولت چھین کر غریب و مفلس صحابہ کرام پر تقسیم نہیں کر دی بلکہ دونوں میں ایک ایسی اسپرٹ پیدا کر دی کہ غریب دوسرے کے غنا سے بے نیاز ہو کر، اپنی غربت کو 'صبر و توکل' کی

چادر میں لپیٹے اپنے کو کامیاب سمجھ رہا ہے اور بالکل مطمئن ہے۔ اور دولت مند اپنا سب کچھ خدا کی راہ میں لٹانے کیلئے ہر وقت تیار و مستعد نظر آ رہا ہے۔ اور وقت آنے پر اپنا سب کچھ لٹا کر اپنے اندر سکون و اطمینان کی فراوانی کا احساس کرتا ہے۔۔۔ یہ ہے اسلام کا فطرت کے مطابق قانون کے ساتھ ذہنی انقلاب، جو دولت مندوں کو مٹا کر غریب نہیں بناتا بلکہ غریبوں کو دولت مندوں کا بھائی بنا کر گلے ملا دیتا ہے۔ کوئی انصاف سے بتائے، اس ملانے میں جو خوبی ہے وہ اُس مٹانے میں کبھی آسکتی ہے؟ یہاں یہ بات واضح ہوگئی کہ اسلام کا 'فلسفہ زکوٰۃ' کیونرم کے 'نظریہ مساوات' کے نکل غیر مطابق ہے۔۔۔

دور خلافت راشدہ میں بیت المال کے قیام نے سائل کو دھوکے میں ڈال دیا۔ لیکن کم از کم اُسے یہ تو سوچنا چاہئے کہ اسلام کو کامل و مکمل صورت میں پیش فرمانے والے حضور آریہ رحمۃ اللہ علیہ کے دور میں بیت المال کا کوئی وجود نہیں تھا۔۔۔ معتبر روایات کی بنیاد پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے عہد خلافت میں بیت المال کے نام سے کوئی خزانہ نہیں قائم فرمایا۔۔۔ ہاں ایک روایت کے مطابق عہد خلافت صدیق میں بیت المال کا قیام عمل میں آچکا تھا، لیکن اس کا کوئی نظام مرتب نہ ہو سکا تھا، اسلئے کہ انکے زمانہ میں جب کبھی مال غنیمت آیا، تو مختصر ہونے کی وجہ سے، فوراً لوگوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا، لہذا اسکے جمع کرنے کی کبھی نوبت ہی نہ آئی۔ کم و بیش یہی طریقہ فقر و عالم رحمۃ اللہ علیہ کی حیات مبارک میں بھی رائج تھا۔

البتہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے، جو عامل بحرین تھے، پانچ لاکھ کی رقم کثیر حضرت امیر المومنین کی خدمت میں پیش کی۔ اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجلس شوریٰ کے اہلاس عالم کو طلب فرما کر مرضی معلوم کرنی چاہی، کہ اس خطیر رقم کو دستور سابق کے

طور پر تقسیم کر دیا جائے یا خزانے کی مستقل شکل دی جائے؟۔۔۔ صحابہ کرام ؓ اس مسئلہ میں مختلف الحیال تھے لیکن ولید بن ہشام نے یہ بات کہی کہ: سلاطین شام کے یہاں 'خزانہ' اور 'دفتر' کا الگ الگ محکمہ قائم ہے۔ اس بات کو حضرت امیر المؤمنین ؓ نے بے حد پسند فرمایا۔ چنانچہ سب سے پہلے مدینہ منورہ میں ایک بہت بڑا خزانہ قائم کیا گیا اور اسکی نگرانی کیلئے حضرت عبداللہ بن الزنم ؓ، جو معزز تعلیم یافتہ صحابی ہونے کے علاوہ دیانت داری میں بھی شرط نامہ رکھتے تھے، کو بحیثیت افسر اعلیٰ معمر کیا اور انکے ماتحت کچھ لوگ مزید بھی رکھے گئے۔ مدینہ منورہ کے علاوہ تمام صوبوں اور صدر مقامات میں بھی بیت المال قائم کئے گئے جو علیحدہ محکمہ کی حیثیت رکھتے تھے۔

اس تاریخی تراشے نے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ ادا کیئے زکوٰۃ کیلئے بیت المال کا حجاب اپنانے کو، اسلامی اسپرٹ کا مقتضا سمجھنا، خود اسلامی اسپرٹ کے مفہوم و معنی کے نہ سمجھنے پر مبنی ہے۔ اگر ادا کیئے زکوٰۃ کیلئے حجاب بیت المال کا فقدان اسلامی اسپرٹ کے فقدان کے مترادف ہوتا تو عہد رسالت میں اس کا وجود ناگزیر تھا۔ مگر یہاں صورت حال یہ ہے کہ عہد رسالت تو بڑی بات، عہد صدیقی میں بھی اس کا کوئی باضابطہ وجود نہ ہو۔ مگر مزید براں عہد فاروقی میں اس کے قیام کا مسئلہ سامنے آیا تو بہت سے صحابہ کرام نے اس سے اختلاف بھی کیا۔ تو کیا عہد رسالت و دور صدیقی نیز دور فاروقی میں اختلاف کرنے والے صحابہ، ان سب کو اسلامی اسپرٹ سے خالی قرار دے دیا جائے گا؟

معلوم ہوا کہ بیت المال کا قیام سیدنا فاروقی اعظم ؓ کا اجتہاد تھا جس کو اپنالینا گویا لازمی و ضروری نہ تھا، لیکن دور فاروقی کے تقاضے کے مطابق تھا۔۔۔ نیز۔۔۔ شریعت اسلامیہ کے بھی کسی قانون سے متصادم نہ تھا، اسلئے اپنالیا گیا۔۔۔ اس مسئلہ میں بعض صحابہ کا اختلاف اس بنیاد پر تھا کہ جو چیز عہد رسالت و دور صدیقی سے چلی

آ رہی ہے، اسکو یونہی برقرار رکھنا چاہئے۔ اس تراشے نے یہ بھی ظاہر کر دیا کہ بیت المال کا قیام اموال غنیمت کو جمع کرنے کیلئے عمل میں لایا گیا تھا۔ ایسا نہیں کہ زکوٰۃ لوگوں سے وصول کر کے بیت المال میں جمع کی جائے اور پھر مساکین پر اس کی تقسیم کرادی جائے۔ اسلئے کہ اس کام کیلئے بیت المال کی ضرورت ہی کیا تھی۔ یہ تو لوگ انفرادی طور پر کر رہی رہے تھے۔ اور اس پر ہر دور میں اتنا پابند تھے کہ جب بعض لوگوں نے عہد صدیقی میں زکوٰۃ دینے سے انکار کیا تو ان سے قتال تک کی نوبت آ گئی۔

مذکورہ بالا اس تحریر سے ظاہر ہو گیا کہ سائل کا یہ الزام غلط ہے کہ انفرادی طور پر زکوٰۃ دینے کا جواز علمائے کرام نے نکالا ہے۔ غور فرمائیے کہ عہد رسالت میں جبکہ بیت المال کا کوئی تصور نہیں تھا، وہاں زکوٰۃ نکالنے کی کیا صورت تھی۔ ظاہر ہے کہ انفرادی طور پر زکوٰۃ نکالنے کا حکم دیا گیا اور وہ اسی حکم کے مطابق زکوٰۃ نکالتے رہے۔ تو کیا اس دور میں یہ سب کچھ علماء نے کیا تھا؟۔۔۔ معلوم ہوتا ہے کہ سائل کا تاثر بخیر مطاعہ بھی نہایت ناقص ہے۔۔۔

زکوٰۃ دینے اور لینے والے کے درمیان سائل جس حجاب کی ضرورت محسوس کر رہا ہے، وہ حجاب عذاب بھی بن سکتا ہے۔ خصوصاً اس دور میں جبکہ، خود سائل کے نزدیک، موجودہ انسان اس قدر پستی میں آ گیا ہے جہاں نفسانیت کا اس پر تسلط ہے، غلبہ و اقتدار کی ہوس کا شکار ہے، دیانت و امانت جیسے الفاظ بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں، ایسی صورت میں یہ حجاب عذاب یوں بنے گا کہ نہ تو دینے والے کو پتہ چلے گا کہ میری بیت المال میں جمع کردہ رقم کہاں گئی اور نہ مستحقین کو معلوم ہو سکے گا کہ کس نے لیا اور کیا لیا اور بیت المال کی ساری پونجی یا اچھی خاصی پونجی امین و خازن اور اعلیٰ اعموان و انصار کے مخصوص بیت المال تک پہنچ جائے گی۔ یہ توقع ظن غالب اور ظن غالب آگے بڑھ کر یقین کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ میر

المالوں پر ان اشتراکیوں یا اشتراکی جیسوں کا تسلط ہے، جنکے نزدیک خوفِ خدا تو بڑی چیز، وجودِ خدا بھی کوئی معنی نہیں رکھتا، نیز جنکے مذہب میں آخرت اور مواخذہ کی کوئی حیثیت نہیں۔۔۔ جن کو اگر کچھ خوف ہے تو صرف محاسبہء انسانی کا خوف ہے اور یہ ظاہر ہے کہ انسانی محاسبہ کی زد سے اپنے کو بچائے رکھنا تو انسانوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے، بالخصوص ایسے پر آشوب دور میں جبکہ سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوں، ایسے ماحول میں اس محاسبہ کا بھی کیا سوال رہ جاتا ہے۔ بیت المال کے قیام سے پہلے ان اصولوں کو اپنا لیجئے جو ایک انسان کو عبداللہ بن ارقم بنا دیتے ہیں اور وہ ہیں اسلامی اصول۔ ان اصولوں کو جب آپ اپنا لیجئے گا تو پھر عبداللہ بن ارقم جیسوں کے نقش قدم پر سر رکھ کر چلنے کا سلیقہ آ جائے گا۔۔۔

سائل نے یہ بھی غور نہیں کیا کہ جب اسکے نزدیک ہر صاحبِ نصاب توقع رکھتا ہے کہ اس سے زکوٰۃ حاصل کرنے والے افراد اور ادارے اسکے مرہونِ منت رہیں تو پھر اس توقع سے کون سی چیز روک سکتی ہے کہ خود بیت المال اسکا مرہونِ منت ہو یا کم از کم وہ مساکین رہیں احسان ہوں جنھیں بیت المال سے روپیہ مل رہا ہو۔ اسلئے کہ مستحقین کو جو رقم مل رہی ہے وہ انھیں اصحابِ نصاب ہی کی تو عطا کردہ ہے۔۔۔ خود سائل ہی نے اس بات کی تصریح کر دی ہے کہ اصحابِ نصاب کی احسان مندی کی توقع صرف افراد ہی سے نہیں بلکہ اداروں سے بھی متعلق ہوتی ہے۔۔۔ اور بیت المال بھی ایک ادارہ ہی ہے۔ جس طرح دوسرے ادارے، دینے والے اور مستحقین کے درمیان، صرف واسطہ و وسیلہ کی حیثیت رکھتے ہیں، وہی حال بیت المال کا ہے، تو پھر جو توقع عام اداروں سے وابستہ کی جاسکتی ہے وہی بیت المالوں سے بھی وابستہ کی جاسکتی ہے۔۔۔ الحاصل۔۔۔ بہ گمان سائل جس نفسانی کجی کی درستی کیلئے یہ نظام قائم کیا گیا ہے، اسکا امکان تو اس کے قیام کے بعد بھی بدستور اپنی جگہ پر ہے، گو صورت بدلی

ہوئی ہے۔۔۔ ان جملہ تحقیقات کو پیش نظر رکھ کر اب مسائل خود ہی فیصلہ کر لے کہ زکوٰۃ
ترکیہ قلوب اور غربا پروری کا سبق دیتی ہے یا سرمایہ پرستی کا؟۔۔۔
۔۔۔ آئیے اب مسائل کا آخری سوال ملاحظہ فرمائیے:

’حج صاحب استطاعت پر فرض ہے۔ صرف متمول ہی حج کر سکتے ہیں۔
بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حج دنیا کے سارے مسلمانوں کے اجتماعی مسائل
حل کرنے کیلئے بطور عبادت فرض قرار دیا گیا ہے، اور علماء یہ کہتے بھی ہیں،
لیکن آج تک حج نے کسی بین الاقوامی مسئلہ کو حل نہیں کیا۔ اس کی مثالیں کئی
دی جاسکتی ہیں۔ مثلاً: روسی مسلمانوں کے مسائل اور ہندوستانی مسلمانوں
کے مسائل۔ اس طرح آج کل حج، متمول لوگوں کیلئے ایک تفریح سے زیادہ
کچھ نہیں ہے، بلکہ موجودہ سعودی عرب کی ترقی نے تو اس قدر ریاکاری پیدا
کر دی ہے کہ حج ایک تجارت بن گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ متمول کو
متمول تر بنایا جائے۔۔۔

مسائل کے اس سوال کی بنیاد اس مفروضے کو تسلیم کر لینے پر ہے کہ حج دنیا کے
سارے مسلمانوں کے اجتماعی مسائل حل کرنے کیلئے بطور عبادت قرار دیا گیا ہے۔
اب اگر یہ ثابت کر دیا جائے کہ مسائل کا یہ مفروضہ بے بنیاد و غیر صحیح ہے تو مسائل کے
سوال کی ساری عمارت زمین پر آ رہے۔۔۔ درحقیقت فریضہ حج، سالانہ اس اسلامی
وحدت کا ایک عالمی مظاہرہ پیش کرتا ہے جس میں قوم و وطن، رنگ و نسل، اور زبان و
بیان کی تفریق کوئی حیثیت نہیں رکھتی ہے۔۔۔ روسی ہوں کہ حبشی، ہندی ہوں کہ چینی،
روسی ہوں کہ امریکی۔۔۔ الغرض۔۔۔ عربی ہوں کہ عجمی، حرم کی مقدس سرزمین پر سب
کے کردار، گفتار اور رفتار کی یکسانیت و وحدت بتا رہی ہے کہ مسلمان مختلف قوموں کے
مجموعے کا نام نہیں بلکہ خود ایک قوم کا نام ہے۔ جب تک رنگ و نسل اور زبان و بیان کی

بنیاد پر قوموں کی تشکیل کی جائے گی اس وقت تک انسانوں کے درمیان ایک عالمی انتشار و افتراق ناگزیر ہے۔۔۔ قربان جائیے اسلام پر! جس نے قوموں کے بکھرے ہوئے شیرازے کو ایک لڑی میں پرو کر ان کو صرف ایک قوم کی صورت دیدی، جس کو مسلمان کہا جاتا ہے۔ اسلام کا دعویٰ ہے کہ رنگ و نسل اور زبان و بیان کی بنیاد پر قوموں کی تفریق، یہ خود انسانوں ہی کی اپنی خود ساختہ تفریق ہے۔ 'الہی قانون' سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔۔۔ اس تفریق سے انسانوں کے خود اپنے اغراض و مقاصد متعلق ہیں۔۔۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اسلام اپنے اس دعویٰ میں سچا نہیں۔ تاریخ کے اوارق اس دعویٰ کی صداقت کے اظہار کیلئے کافی ہیں۔ جا بجا اسلامی کانفرنسوں کا ہونا کوئی نئی بات نہیں، جن میں وحدت اسلامی کے عنوان سے دھواں دھار تقریریں ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن اسٹیج پر اتنا موقع کہاں میسر آ سکتا ہے کہ گفتار کو کردار کے روپ میں پیش کیا جاسکے۔ لہذا ضرورت ہے کہ سال میں کم از کم ایک ایسی عالمی کانفرنس ہوتی رہے جس میں وحدت اسلامی کو گفتار کے بجائے کردار سے ثابت کیا جائے تاکہ گفتار کے اسٹیج سے ذہن انسانی کو وحدت اسلامی کے متعلق جو دعوت غور و فکر ملتی ہے کردار کا اسٹیج اس وحدت کا مشاہدہ کراتا رہے۔ اسی کردار کی کانفرنس کی ضرورت فریضہ حج سے پوری ہوتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ حج کے مقدس اور سنہرے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دنیا کے سارے مسلمانوں کے اجتماعی مسائل کے حل کرنے کی بھی اگر کوئی صورت نکالی جائے تو نکل سکتی ہے۔ لیکن اس کو فریضہ حج کی علت نہیں قرار دیا جاسکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلام نے ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایک ایسا حسین موقع عطا فرمادیا ہے جس میں 'ادائیگی فریضہ' کے بعد اگر سب لوگ چاہیں تو اپنے گونا گوں اجتماعی مسائل کے حل کی صورت نکال سکتے ہیں۔

یہی مطلب ہے علماء کرام کے ارشاد کا، جس کو سائل نے کچھ الٹا ہی سمجھا۔

اس گفتگو سے یہ حقیقت ظاہر ہو گئی کہ اسلام نے جس تصور کے پیش نظر حج کو فرض قرار دیا ہے، وہ ایک اہم ترین تصور ہے جس کو سیر و تفریح سے کوئی لگاؤ نہیں۔ اب اگر کوئی نادان اس کو سیر و تفریح ہی قرار دے تو اسے اس کی نادانی کہا جائے گا۔ اس سے اسلام کا دامن کہاں داغ دار ہوتا ہے؟۔۔۔ اسی طرح اگر کوئی حج کو ذریعہ تجارت بنالے تو اس کا الزام اسی فرد کے سر پر رکھا جائے گا۔ افراد کی غلطی یا ذہنی کجی اس دستور کی غلطی و کجی نہیں جس دستور کو ماننے کے یہ دعویٰ ہیں۔ اگر اعتراض کرنے کی یہی روش رہی تو دنیا کا کوئی دستور اپنے دامن عصمت کو بچا نہ سکے گا۔ اسلئے کہ اسکے ماننے کا ادعا کرنے والے اگر سب کے سب نہیں تو بعض تو ایسے نکل ہی آئیں گے، جو اس دستور کے مخلص و فادار نہیں۔ کسی دستور پر اگر تنقید کرنی ہے تو پہلے افراد سے صرف نظر کیجئے پھر کہیں جا کر اہل فہم حضرات کے نزدیک آپ کی تنقید کی کچھ وقعت ہو سکے گی۔ مگر شرط یہ ہے کہ نقاد، نقد و نظر سے پہلے متعصبانہ نقطہ نظر سے اپنے دامن دل و دماغ کو پاک کر چکا ہو اور اسکی تنقید کا منشأ صرف ایک منزل میں بیٹھ کر، خواہ مخواہ کیلئے دوسری منزل پر صرف پتھر پھینکا نہ ہو۔ موجودہ سعودی حکومت کی ریاکاریاں، مکاریاں، زبوں کرداریاں سب مسلم، لیکن اس سے اسلام کے دامن کو داغ دار سمجھنا یا فریضہ حج کی ضرورت محسوس نہ کرنا کون سا حتمندانہ طرز فکر ہے۔۔۔ نہ تو سعودی حکومت کا نام اسلام ہے اور نہ اسلام کا نام سعودی حکومت۔۔۔ یہ تو وقت کا کتنا بڑا المیہ ہے کہ ایک داغ دار کے دامن کے دھبوں کو دوسرے پاک طینت کے دامن کا داغ قرار دیا جا رہا ہے۔ اور یہ کوشش نہیں کی جا رہی ہے کہ جو اصل مجرم ہے اسکے جرم کی اسے سزا دی جائے یا کم از کم اس کی اصلاح کی صورت نکالی جائے۔

سعودی حکومت کی موجودہ ساری بے عنوانیوں کا الزام اسلام کے سراشی وقت آسکتا تھا جبکہ وہ خود اس کی تائید کرتا اور فریضہ حج کو انہی ریاکاریوں کیلئے فرض

قرار دیتا۔ لیکن جب دستورِ اسلام میں ایسی واضح دفعات موجود ہیں، جس سے پتہ چلتا ہے کہ سعودی حکومت کی سیاہ کاریاں، ہدایت نہیں ضلالت ہیں۔ سلامت روی نہیں، گمراہی ہیں۔ ایمان نہیں، ایمان شکنی ہیں۔ اسلام نہیں، اسلام دشمنی ہیں۔ تو پھر سعودی بے اعتدالیوں کو اسلام کے سر تھوپ کر اسے اسلام کی بے اعتدالی سمجھنا کہاں کی ہوشمندی و اعتدال پسندی ہے؟۔۔۔۔۔

هَذَا مَا عِنْدِي وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ اَعْلَمُ

ایک تعلیم یافتہ خاتون کے تین سوالات

شہر جون پور کی ایک تعلیم یافتہ خاتون نے تین سوالات، شیخ الاسلام، حضرت علامہ سید محمد مدنی اشرفی، جیلانی مدظلہ العالی، جانشین حضور محدث اعظم ہند رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پیش کئے تھے اور تحریری جواب کی فرمائش کی تھی۔ یوں تو کہنے کیلئے یہ صرف تین سوالات ہیں لیکن حقیقت میں ہر سوال ایک 'جہان خیال' کی حیثیت رکھتا ہے اور جماعت اسلامی کے تمام انکار کا حاصل ہے۔

--- سوالات:

۱۔ ہم لوگوں کو کس اسلام کی دعوت دیں۔ اُس اسلام کی جو حضور ﷺ لائے تھے اور جو حضور ﷺ کے بعد خلافت راشدہ کے دور تک سر زمین عرب پر جلوہ افروز رہا اور پھر اسکے بعد اب تک محض خواب و خیال ہے یا اس اسلام کی جو آج کل مسلمانوں کی مختلف جماعتوں، ٹولیوں اور گروہوں میں تقسیم ہو گیا؟

۲۔ اسلام کا مزاج چاہتا ہے کہ اسکے ماننے والے اسکی اپنی حکومت قائم کریں۔ کیونکہ غیر اسلامی نظام میں مکمل اسلام پر عمل ہی نہیں ہو سکتا۔۔۔ مثلاً: نہ چور کا ہاتھ کاٹا جاسکتا ہے اور نہ حدود جاری کی جاسکتی ہیں، نہ سود سے بچایا جاسکتا ہے، نہ جہاد کیا جاسکتا ہے، وغیرہ۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ گذشتہ ۱۳۰۰ سال سے اسلام اپنے رنگ و روپ میں زمین کے کسی حصہ میں نہ موجود تھا اور نہ اب ہے۔ اس کوتاہی کا ذمہ دار کون ہے یا یہ اسلام ہی کا نقص تو نہیں؟

۳۔۔۔ اگر اسلام ایسا ہی خیالی، وہمی اور ناقابل عمل نظام زندگی ہے جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ خلافت راشدہ کے ختم ہو جانے کے بعد پھر خود صحابہ و تابعین اور تبع تابعین جیسی مقتدر ہستیاں دوبارہ اس نظام کو اس کے اصلی رنگ و روپ میں جاری و نافذ نہ کر سکیں تو پھر ہم ہندوستانی مسلمان خواہ مخواہ کیوں لکیر پٹیتے رہیں اور نقصان اٹھاتے رہیں! ہم کیوں نہ وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لادینی کی راہ اپنائیں؟



تین سوالوں کا جواب

سائل نے بظاہر تین سوالات کئے ہیں لیکن ہر سوال کے بطن میں کئی ایک سوال نظر آئے۔ لہذا میں نے مناسب خیال کیا کہ جواب سے پہلے ایک ایسی تمہید پیش کر دی جائے جس سے باسانی تمام سوالات کے جوابات حاصل کئے جاسکیں۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرا یہ جواب سائل کیلئے کہاں تک اطمینان بخش ہوگا۔ لیکن دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو حق سمجھنے اور صداقت کو اپنانے کی توفیق عطا فرمائے! اپنی علمی کم مائیگی کے اعتراف کے ساتھ فضل الہی پر بھروسہ کرتے ہوئے یہ عرض کروں گا کہ اگر سائل اس جواب کے کسی حصے سے مطمئن نہ ہو تو وہ اُس کے بارے میں مزید تبادلہ خیال کر سکتا ہے اور اپنے رفع شبہات کیلئے وہ دوسرے سوالوں کو بھی عنوان گفتگو بنا سکتا ہے، بشرطیکہ حقیقت امر کو معلوم کر لینے کے بعد اسے تسلیم کرنے میں وہ کوئی پس و پیش نہ کرے اور ایسا کوئی قدم نہ اٹھائے جو دیانت و اخلاص کے منافی ہو!

اسلام کسی ملکی، شہری، خانگی، بیرونی، مجموعی یا انفرادی نظام زندگی کا نام نہیں بلکہ یہ ان اٹل، بے بدل اور غیر متبدل قوانین الہیہ کا نام ہے جس کا امین و محافظ صحیفہ ربانی یعنی قرآن کریم ہے اور رسول کریم ﷺ کی سنت کریمہ ہے!

ہاں، بلاشبہ یہ قوانین و اصول اپنے اندر ایسی جامعیت رکھتے ہیں کہ ملکی و شہری، خانگی و بیرونی، مجموعی و انفرادی اور دنیوی و اخروی زندگی کی فلاح و بہبودی کا واحد علاج ہیں اور ہر شعبہ حیات کیلئے تاقیام قیامت مینارۂ ہدایت ہیں۔ اسلام کی

زندگی فی الحقیقت انہیں تو انین کی زندگی ہے اور اسکی موت دراصل انہیں اصولوں کی موت ہے۔ اسے دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ اسلام اس وقت تک فنا نہیں ہو سکتا جب تک کہ یہ تو انین فنا نہ ہو جائیں۔ لہذا ان تو انین کے وجود کو تسلیم کر لینے کے بعد اسلام کے وجود کا اقرار کرنا لازمی و ناگزیر ہے۔

بفرض محال اگر صفحہء وجود پر کوئی مسلمان نہ ہو لیکن غیر مسلم کے دل میں یا اس وسیع کائنات کے کسی بھی حصے میں قرآن کریم اور رسول اکرم ﷺ کے اقوال و افعال، نیز تقاریر کے جواہر تابناک موجود ہوں تو ایسی مفروضہ صورت میں یہ کہنا درست ہوگا کہ صفحہء ہستی پر کوئی مسلمان نہیں۔ لیکن یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ اسلام فنا ہو گیا! اسلئے کہ تو انین کا وجود اور شے ہے اور ان کا نفاذ دوسری بات ہے۔ 'عدم نفاذ'، 'عدم وجود' کو مستلزم نہیں۔۔۔ حاصل کلام یہ ہے کہ قرآن مقدس اور سنت کریمہ کی پاکیزہ تعلیمات سے کائنات کا دامن جب تک بالکل خالی نہ ہو جائے، اسلام اور وہی پرانا اسلام، دائم و قائم رہے گا۔

اسلام بنیادی طور پر تمام شعبہ ہائے حیات میں انسانوں کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی ہدایت دیتا ہے۔ اسکا مطالبہ یہی ہے کہ ارادوں کی تکمیل کا جو نقشہ مرتب کیا جائے، وہ صراطِ مستقیم سے جدا گانہ نہ رہے۔ بس اسی کو اسلام کا مزاج بھی سمجھئے۔

یہ تو ایک اصولی اور عقلی بات تھی جسکی طرف میں نے اس احساس کے ساتھ چند لفظوں میں اشارہ کر دیا کہ ابھی یہ تشنہء تفصیل ہے۔ لیکن اہل فہم و فراست پر اتنا بھروسہ ہے کہ وہ اس اجمال کو ذرا سادہ تامل کے بعد تفصیل کا لباس پہنا سکتے ہیں۔

اس گفتگو سے اشارہ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اگر نام نہاد مسلمان مختلف گروہوں اور ٹولیوں میں تقسیم ہو گئے ہیں تو یہ انہی نام نہاد مسلمانوں کی تقسیم ہے، اسلام کی تقسیم نہیں۔ اس بات کی مزید وضاحت کیلئے یہ ارشادِ بانی ملاحظہ ہو۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ﴿۹۰﴾
 ہم ہی نے ذکر حکیم (قرآن کریم) کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اسکی حفاظت کرنے والے ہیں۔
 -- ایک ارشاد نبوی ﷺ بھی ہے:

وَعَنْ مُعَاوِيَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ لَا يَزَالُ مِنْ أُمَّتِي
 أُمَّةٌ قَائِمَةٌ بِأَمْرِ اللَّهِ لَا يَضُرُّهُمْ لَهْمٌ وَلَا مَنُ خَالَفَهُمْ
 حَتَّى يَأْتِيَ أَمْرُ اللَّهِ وَهُمْ عَلَى ذَلِكَ (متن مایہ)

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے خود نبی کریم ﷺ سے سنا ہے۔
 آپ نے فرمایا کہ ہمیشہ ایک گروہ رہے گا جو امر دین و شریعت کو برپا کرے گا،
 ایسے کونہ تو اپنوں کا عدم تعاون نقصان پہنچا سکے گا اور نہ مخالفین کی مخالفت --
 یہاں تک کہ قیامت قائم ہو اور وہ گروہ اپنے اسی حال پر رہے۔

-- ایک ارشاد قرآنی اور ملاحظہ ہو:

وَاتَّبِعُوا أَحْسَنَ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ
 الْعَذَابُ بِغَتَّةٍ وَأَنْتُمْ لَا تُشْعُرُونَ ﴿۵۵﴾

چلو اسکے بہتر پر جو تمہارے رب نے تمہاری طرف نازل فرمایا،
 قبل اسکے کہ چانک قیامت آجائے اور تمہیں خبر نہ ہو

مذکورہ بالا نصوص سے پتہ چلتا ہے کہ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ ہی کا دوسرا
 نام اسلام ہے۔ اور یہ اس وقت تک قائم رہے گا جب تک قیامت نہ آجائے۔ یہی
 وجہ ہے کہ قیام قیامت سے پہلے اسکی اتباع و پیروی کا حکم دیا جا رہا ہے ورنہ دوسری
 صورت میں اسکی اتباع کا مطالبہ غیر معقول اور غیر حقیقی قرار پاتا۔ قرآن حکیم نے یہ
 بات بھی بتادی کہ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ کا محافظہ خدائے عزوجل ہے، جو گردش

لیل و نہار کا شکار نہ ہو سکے گا۔ اسی طرح ارشاد نبوی ﷺ نے واضح فرمادیا کہ ہر دور میں ایک ایسی مقدس جماعت کا وجود رہے گا جو صحیح معنوں میں اسی اسلام کی حامل ہوگی اور اسی اسلام کی ترویج و اشاعت میں مصروف و منہمک رہے گی جسکی تعلیم قرآن و حدیث نے دی ہے۔

آج اسلامی حکومت دنیا کے کسی حصہ میں نہیں ہے لیکن اسلام دنیا کے ہر گوشے میں موجود ہے اور یہ حقیقت اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ 'اسلامی حکومت' کچھ اور ہے اور دین اسلام کچھ اور۔ یہ دونوں عین نہیں کہ ایک کے بغیر دوسرا نہ پایا جائے۔ یہ سچ ہے کہ اسلامی حکومت کی موجودگی میں اسلام کا ہونا نہایت ضروری امر ہے۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اسلام تو ہو اور اسلامی حکومت نہ ہو، جیسا کہ آجکل مشاہدہ ہے۔ بس یہی مادہ افتراق عینیت کی نفی کیلئے کافی ہے۔ اگر یہ بات فرض کر لی جائے کہ اسلامی حکومت نہیں تو اسلام بھی نہیں۔ ایسی صورت میں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ آج دنیا میں کوئی مسلمان نہیں۔۔۔ اس اقرار کے بعد اب کسی سے اسلامی حکومت کے قیام کا مطالبہ کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ یہ طرز عمل تو کچھ ایسا ہی ہے گویا غیر مسلموں کے سامنے اسلامی حکومت کے قیام کا منصوبہ رکھا جائے!

اسلامی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد وہ نظام خلافت دوبارہ قائم نہ ہو سکا لیکن اسلام رہا اور وہ فنا نہیں ہوا۔ خلافت کا عروج و زوال دراصل اسلام کا عروج و زوال نہیں۔ اسلام وہ آفتاب ہے جو ہمیشہ نصف النہار پر رہا ہے اور رہے گا۔ اب ذرا دیر کیلئے فرض کر لیجئے کہ ساری دنیا میں خلافت راشدہ قائم ہوگئی اور مسلمان سچا مسلمان بن گیا۔ اب نہ چوری اور ڈکیتی کا کہیں نام و نشان ہے اور نہ بدکاری و بدقماش کی گرم بازاری ہے۔ اب پورے طور پر برائیاں ختم ہوگئی ہیں اور نیکیوں کا تسلط ہو گیا ہے۔ اس صورت حال پر اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ اسلام کا مزاج یہ

چاہتا ہے کہ ساری دنیا میں اسلام کی حکومت نہ ہو اور نہ اسلامی حکومت میں سارے افراد نیک سیرت ہوں ورنہ مکمل اسلام پر عمل ہی نہیں کیا جاسکتا۔ اسلئے کہ جب کوئی شخص چوری ہی نہ کرے گا تو قانون قطعاً کیسے استعمال کیا جاسکتا ہے؟ جب کہیں کوئی کافر ہی نہیں تو پھر قانون جہاد پر عمل کی صورت کیا ہو سکتی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ اس مہمل اور بے معنی اعتراض پر آپ متبسم ہوں گے اور خیال کریں گے کہ معترض نے اسلام کا مزاج ہی نہیں سمجھا اور نہ اسے یہی معلوم ہے کہ اسلام کی کون سی دفعہ کس وقت اور کس ماحول کیلئے ہے!

اللہ تعالیٰ پر اس کی جملہ شیونات ربانیہ اور محمد رسول اللہ ﷺ پر ان کی تمام صفات مصطفویہ کی تصدیق کے ساتھ ایمان لانا ہی اسلام کا وہ پہلا اور بنیادی مطالبہ ہے جس کا مخاطب سارا عالم ہے۔ اسکے بعد جملہ فرائض، واجبات اور موکدات خاص طور پر ان کیلئے ہیں جو اپنے دل و دماغ کے اعتبار سے مؤمن بن چکے ہیں۔ یہاں اس بات کو ذہن میں ضرور رکھئے کہ اسلام عرب و عجم کی طویل و عریض زمین کا نظام سمجھانے کیلئے نہیں بھیجا گیا ہے بلکہ عربی و عجمی قلوب و اذہان کی اصلاح اس کا اصل مقصود ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ اسلام نے اس ثانوی امر کا بھی خاص لحاظ رکھا ہے کہ اہل ایمان کی بتدریج ترقی سے ان کی اجتماعی زندگی کا دائرہ جب وسیع ہوگا تو قدرتی طور پر بہت سارے مسائل بھی پیدا ہونگے اور ان مسائل کے حل کیلئے ایک ایسے نظام کی بھی ضرورت پڑے گی جو آخرت کے حقیقی تصور کے ساتھ مادی یا دنیوی زندگی کے تمام تقاضوں کو محیط ہو۔

چنانچہ جب اہل ایمان کی آبادی کو فروغ ہوا اور کشمکش حیات نے نئے نئے مسائل پیدا کئے تو اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں ایک نظام کی تشکیل کی گئی جس کا دوسرا نام خلافت راشدہ ہے۔ یہاں پھر عرض کر دوں کہ خلافت یا حکومت اسلام کا مقصود

نہیں اور نہ اسلام کی بقا اس پر منحصر ہے۔ ایک مثال سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔ فرض کیجئے کہ ساری دنیا کے انسان عقیدہ و عمل کے لحاظ سے مومن کامل ہو جائیں، ان سے صدور معصیت و خطا ممکن ہی نہ رہے۔ اور اسلام کے جملہ مطالبات کو پورا کرنا انکی فطرت بن جائے تو ایسی صورت میں اب نہ کسی ظاہری نظام حکومت کی ضرورت ہے اور نہ کسی کے خلیفہ یا امیر بننے کی حاجت ہے۔ اسلئے کہ انسانی برادری کے ہر فرد کا عمل اسلام کی حکمرانی اور اس کے تسلط کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس مثال سے یہ بتانا مقصود نہیں کہ اسلامی نظام حکومت کا قیام بے سود اور عبث ہے بلکہ منشاء کلام یہ ہے کہ اسلام کے وجود کا انحصار کسی حکومت کی طاقت و شوکت پر نہیں ہے۔ وہ بغیر حکومت کے بھی قائم و دائم رہا ہے اور رہے گا۔

بعض لوگوں کو اسلام کے اصول جو آج خلاف فطرت نظر آتے ہیں، تو اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی فکر و نظر کا صحیح توازن برقرار نہ رکھ سکے۔ اسی عدم توازن نے انکی فطرت میں بگاڑ پیدا کر دیا ہے اور جب انکی فطرت ہی صحت سے عاری ہے تو اسلام کے اٹل اور غیر مبدل اصول اس سے کس طرح ہم آہنگ ہو سکتے ہیں! ان لوگوں کی کج نظری کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہوگی کہ انھوں نے اپنی مسخ شدہ فطرت ہی کو معیار حق بنالیا ہے اور اپنی زندگی کو اسلام کا تابع بنانے کے بجائے اسلام ہی کو اپنی خواہشات کا محکوم بنانا چاہتے ہیں۔ ایسی صورت میں خلفشار اور کشاکش کا پیدا ہونا ضروری ہے اور اسکے خوفناک مناظر ہماری نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔

اسلام نے ساری انسانیت کو جس ضابطہ حیات کی تعلیم فرمائی ہے اور ہر شعبہ حیات کیلئے جو قوانین مرتب کئے ہیں، پہلے ان کا نفاذ ضروری ہے، پھر دنیا کو خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ موجودہ زندگی کی محرومیوں کو دور کرنے کیلئے اسلامی اصولوں کی کس قدر ضرورت ہے؟۔۔۔ نافذ کرنے سے قبل ہی اسلامی اصولوں کو ناقابل عمل

کہنا ایک پاگل کی بڑ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ مخالفین نے اسلام کے مقابل جو اپنے نظام کی تشکیل کی ہے تو اس کا یہ مفہوم نہیں کہ وہ اسلام کو ناقابل عمل سمجھتے ہیں۔ یہ تو محض ان کا جذبہ بغض و عناد ہے، جس نے انھیں ایک پاکیزہ نظام زندگی سے علیحدہ کر دیا ہے۔ اور غضب تو یہ ہے کہ وہ یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ ان کا مصنوعی نظام اسلامی نظام کا جواب اور توڑ ہے۔ شاید اہل نظر اس حقیقت سے غافل نہیں کہ مخالفین کے بنائے ہوئے نظام کو جس کا مقصد کم سے کم عیش و نشاط کی کا بجوئی اور زیادہ سے زیادہ اقوامِ عالم پر بے محابہ چیرہ دستی ہے، اسلام کے محکم نظامِ حیات سے کیا نسبت؟

چہ نسبت خاک را با عالم پاک!

اس مختصر تمہیدی گفتگو کو ذہن نشین کر لینے کے بعد آپ اپنے سوالات کا

بالترتیب جواب ملاحظہ فرمائیے:

﴿۱﴾۔۔۔ اسی اسلام کی دعوت دیجئے جو نبی کریم ﷺ لائے تھے، جو آج بھی موجود ہے اور جس سے کٹ کٹ کر باطل جماعتیں نئے نئے نام سے متعارف ہو چکی ہیں۔ لیکن جماعت ساز یوں کے باوجود وہی پرانا اسلام آج بھی اکثریت کے دل و دماغ پر حکومت کر رہا ہے۔ اور جسے خواب و خیال سمجھنا قرآن و حدیث کا صریح انکار ہے۔

﴿۲﴾۔۔۔ اسلام کا مزاج کیا ہے؟ اسے تمہید میں پیش کر چکا ہوں۔ آپ دوبارہ ملاحظہ کیجئے۔ اسلام کا ایک ہی رنگ ہے، ایک ہی روپ ہے، اس میں نہ کبھی کوئی فرق آیا اور نہ آج ہے۔ البتہ خلافت و حکومت کے بہت سے ادوار ہیں اور ہر دور کے مختلف رنگ اور مختلف روپ تاریخ کے صفحات سے ظاہر ہوتے ہیں۔

﴿۳﴾۔۔۔ خلافت راشدہ کے بعد صحابہ اور تابعین کا مقدس وجود اس بات کی دلیل ہے کہ اگرچہ وہ در خلافت نہیں رہا، لیکن اسلام اپنے تقدس و طہارت اور عظمت و رفعت کے ساتھ اس زمانہ میں موجود تھا اور ان پاکیزہ نفوس کے دل و دماغ پر حکومت کر رہا

تھا۔ اسی طرح ہر دور میں ایک مقدس جماعت کا وجود بتا رہا ہے کہ اسلام کا آفتاب نیم روز کبھی ڈھلا ہی نہیں۔ اس علم کے بعد اسلام کو خیالی اور وہمی کہنا یا سمجھنا، خیال و وہم سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتا ہے۔ اب ہمارے لئے اسکے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ ہم اپنی دنیوی اور اخروی فلاح و بہبودی کیلئے صدقِ دل سے پورے اخلاص کے ساتھ اسلام کو اپنائیں اور اس کو اپنی عملی زندگی میں داخل کر لیں۔ آیہ کریمہ:

إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ؕ
 پر توجہ دیں۔۔۔ انھیں، مُنْعِمٌ عَلَيْهِمْ یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء، نیز صالحین کے راستے پر چلیں اور آیہ کریمہ:

فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ
 وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا ﴿۶۹﴾

۔۔۔۔۔ سے جو ہدایت مل رہی ہے، اسے بسر و چشم قبول کریں۔



تحریم اور فلسفہ تحریم

بعض حدیثوں میں آیا ہے:

‘إِنَّ إِبْرَاهِيمَ حَرَّمَ مَكَّةَ فَجَعَلَهَا حَرَمًا’

--- یہاں ’تحریم‘ سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں شارحین حدیث کے مختلف قول ملتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ ’تحریم‘ سے مراد دعائے تحریم ہے۔ کسی نے کہا کہ اس سے مراد اعلانِ حرمت و تبلیغ حکم تحریم ہے۔۔۔ دعائے تحریم مراد لینے والے محققین کی دلیل یہ ہے کہ حدیث مذکور میں ’حرم‘ کے فاعل حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں تو اگر ’جعل‘ کا فاعل بھی انہی کو تسلیم کر لیا جائے تو حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرام کر دیا تو انہوں نے مکہ کو حرام کر دیا۔ اس صورت میں ’فَجَعَلَهَا حَرَمًا‘ کا پورا جملہ بیکار ہو جاتا ہے۔ اسلئے ’حرم‘ کے فاعل تو حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی ہیں لیکن ’جعل‘ کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے اور یہاں ’تحریم‘ سے مراد دعائے تحریم ہے۔۔۔ اب حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی کہ وہ مکہ کو حرام کر دے تو اللہ نے اس کو حرام فرما دیا۔۔۔ اور جو اعلان و تبلیغ مراد لیتے ہیں، انکا کہنا ہے کہ ’حرمت مکہ بہت پہلے سے چلی آرہی تھی لیکن طوفانِ نوح کے بعد اسکی حرمت کے مبلغِ اوّل سیدنا ابراہیم علیہ السلام تھے، لہذا ’تحریم‘ کی نسبت انکی طرف کر دی گئی۔۔۔

ان ساری توجہوں اور تاویلوں کا سبب یہ ہے کہ بعض حدیثوں میں ہے:

‘إِنَّ هَذَا الْبَلَدَ حَرَّمَ اللَّهُ’

بیشک اس شہر مکہ کو اللہ نے حرام فرمایا ہے

۔۔۔ اور بعض حدیثوں میں ہے کہ:

مکہ حرام بہ حرمت اللہ ہے

۔۔۔ یہ روایتیں چونکہ روایت اولیٰ کے معارض ہیں لہذا دونوں قسموں کی روایتوں سے دفع تعارض کیلئے شارحین کرام کو مذکورۃ الصدر تا ویلیں کرنی پڑیں۔ اگر روایتوں میں 'تحريم' کی نسبت اللہ کی طرف نہ ہوتی تو یہ اشکال پیدا نہ ہوتا۔ تو پھر کسی تاویل کی حاجت بھی نہ ہوتی۔ لہذا 'حدیث تحریم ابراہیمی' کو دلیل بنا کر یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ جہاں جہاں 'تحريم' یا 'تحلیل' کی اسناد نبی کریم ﷺ کی طرف گئی ہے وہاں صرف 'تبلیغ' و اعلام' یا 'دعاے تحریم' ہی مراد ہے، اسلئے کہ وہ دلیل اس دعویٰ کیلئے مفید نہیں۔۔۔ اس کے چند وجوہ یہ ہیں:

﴿اولاً﴾۔۔۔ دعویٰ عام ہے، دلیل خاص ہے۔ اور دلیل خاص دعویٰ عام کو نہیں ثابت کر سکتی۔

﴿ثانیاً﴾۔۔۔ دعویٰ یہ ہے کہ حضور آیہ رحمت ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے کسی چیز کی 'تحريم' و 'تحلیل' کا اختیار نہیں دیا ہے۔ اور دلیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو مکہ کی تحریم کی ہے وہاں 'تحريم' سے مراد دعاے تحریم' یا 'تبلیغ و اعلام' ہے۔۔۔ دعویٰ مذکور سے اس دلیل کو کوئی تعلق ہی نہیں۔۔۔ اسی قسم کا دعویٰ و دلیل کو دیکھ کر کہا جاتا ہے کہ 'مارے گھٹنا پھوٹے سر'۔۔۔ یا یوں کہیے کہ دعویٰ یہ ہے کہ جہاں کہیں بھی حضور نبی کریم ﷺ کی طرف 'تحريم' یا 'تحلیل' کی نسبت کی گئی ہے وہاں یا تو 'دعاے تحریم' و 'دعاے تحلیل' مراد ہے یا 'تبلیغ تحریم' و 'تبلیغ تحلیل'، یعنی معنی 'حقیقی' مراد نہیں اور دلیل یہ ہے کہ 'تحريم ابراہیمی' میں 'تحريم' کا معنی 'حقیقی' مقصود نہیں۔ اس دعویٰ و دلیل کے تعلق کا بھی وہی حال ہے جو اسکے پہلے والے دعویٰ و دلیل کا تھا۔

﴿ثالثاً﴾۔۔۔ 'تحريم ابراہیم' کی تاویل 'دفع تعارض' کیلئے ہے۔ معنی 'حقیقی'

تقرب کی بناء پر اپنی 'تحریم' قرار دیا تاکہ لوگ سمجھ لیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی 'تحریم' انکے خدا کی 'تحریم' ہے۔ جس طرح خدا کی تحریم واجب التعمیل ہے اسی طرح ابراہیم علیہ السلام کی تحریم بھی۔ اسی مفہوم کو دوسری روایتوں میں یوں کہا گیا ہے کہ ---
'إِنَّ هَذَا الْبَلَدَ حَرَّمَ اللَّهُ'

اس شہر مکہ کو اللہ نے حرام فرمادیا

--- گویا اس حدیث میں رسول کریم ﷺ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فعل کو خدا کا فعل قرار دیا تو یہ ---

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَفَعُ

﴿الأنفال: ۱۷﴾

--- کے قبیل سے ہو گیا۔

اس توجیہ سے دونوں طرح کی روایتوں میں یہ آسانی تو فیک ہو جاتی ہے اور کوئی تعارض نہیں رہتا اسلئے کہ اس توجیہ کا حاصل یہ ہے کہ رسول کریم ﷺ نے کہیں 'تحریم' ابراہیمی کی نسبت خود سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی طرف کی اور کہیں بارگاہ خداوندی میں سیدنا خلیل اللہ علیہ السلام کے مقام خلعت و غایت تقرب کے پیش نظر انکے فعل کی نسبت ان کے رب کی طرف فرمادی۔۔۔ حدیث تحریم ابراہیمی میں ہے ---

'إِنَّ إِبْرَاهِيمَ حَرَّمَ مَكَّةَ فَجَعَلَهَا حَرَامًا وَإِنِّي حَرَّمْتُ الْمَدِينَةَ'

بیٹک ابراہیم نے مکہ کی تحریم کی تو انھوں نے اس کو حرم بنا دیا اور میں نے مدینہ کو حرام قرار دیا۔۔۔ اس صورت میں 'جعل' کا فاعل حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی رہے اور ہر ہر لفظ اپنے

حقیقی معنی پر رہا، نیز کوئی جملہ بھی بیکار نہ رہا۔

اگر اس حدیث کا یہ ترجمہ کیا جائے کہ ---

'یقیناً ابراہیم نے مکہ کی حرمت کی دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے

اس کو حرام کر دیا اور یقیناً میں نے مدینہ کو حرام کیا'

--- اس صورت میں بھی کم از کم اتنا تو تسلیم ہی کرنا پڑے گا کہ اگر مکہ کو اللہ تعالیٰ نے حرام فرمایا تو مدینہ کو سرکارِ مدنی نے حرام قرار دیا۔ یعنی اللہ نے اپنے ذاتی اختیار سے مکہ کو 'حرم' بنادیا تو رسول نے خدا کے دیئے ہوئے اختیار سے مدینہ کو 'حرم' فرمادیا۔ حدیث شریف کا طرزِ بیان اسے تسلیم کرنے پر مجبور کر رہا ہے کہ اگر دونوں جگہ 'حرمت' سے مراد 'حرمت اللہ' ہوتی تو الفاظِ حدیث یوں نہ ہوتے۔۔۔

فَجَعَلَهَا حَرَامًا وَأَنَّى حَرَمْتُ الْمَدِينَةَ

مگر یہ سوال اپنی جگہ پر رہا کہ اس توجیہ سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تشریعِ حادث میں 'تحريم' مکہ، زمانہٴ خلیل کے پہلے نہ تھی؟۔۔۔ میں عرض کروں گا کہ جس طرح اس توجیہ پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے اسی طرح اسلافِ کرام کی اس تاویل پر بھی یہی سوال ہوتا ہے کہ 'تحريم' ابراہیمی، میں 'تحريم' سے 'دعائے تحريم' مراد لیا جائے۔ اسلئے کہ جب پہلے تحريم واقع ہو چکی تھی تو پھر 'دعائے تحريم' اور اسکے بعد 'من جانب اللہ تحريم' جیسا کہ حدیث کا ظاہر بھی یہی بتا رہا ہے، تحصیلِ حاصل ہے۔ اسلافِ کرام کی اس توجیہ اور حدیث شریف کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مکہ شریف کی عظیم الشان تقدس و طہارت کے باوجود تشریعِ حادث میں قبل سیدنا خلیل 'تحريم' مکہ نہیں تھی۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی دفعِ تعارض کیلئے جو توجیہ پیش کی ہے اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ زمانہٴ خلیل سے پہلے 'تشریعِ حادث' میں 'تحريم' مکہ نہ تھی۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

'حکم الہی قدیم ہے اور وہی شرائع و احکام کا حاکم اعلیٰ ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی تشریع سے جو حکم ہوتا ہے وہ اسی حکم قدیم پر دال ہے، لہذا جن حدیثوں میں اِنَّ هٰذَا بَلَدٌ حَرَمٌ اللّٰہُ آیا ہے اگر اسکی تاویل کی جائے کہ لَمَّا حَرَمَہُ اِبْرٰہِیْمُ فَذٰلِکَ عَلَیْہِ اَنَّهُ حَرَمَہُ اللّٰہُ فِی تَشْرِیْعِہِ الْقَدِیْمِ یعنی جب حضرت ابراہیم نے تحريم کر دی تو اس سے پہلے چل گیا کہ اپنی تشریعِ قدیم میں اللہ نے اس کو حرام فرمادیا ہے تو کچھ مضائقہ نہیں'

۔۔۔ اور یہ ظاہر ہے کہ صرف انبیاء علیہم السلام ہی نہیں اور صرف انکی طرف سے تشریع ہی نہیں، بلکہ کائنات میں جو ہوا، جو ہوگا، ہر حرکت و سکون تابع فرمانِ الہی ہے اور ساری کائنات کے وجود کے پہلے ہی جملہ احکامات کی تحلیل و تحریم اللہ تعالیٰ نے اپنی تشریع قدیم میں فرمادی تھی۔ لیکن اس کا اظہار مشیتِ الہی کے مطابق ہوتا رہا۔ اگر بعض احکام کی تحلیل و تحریم بذریعہٴ وحی متلوٰ کی، تو بعض کی بذریعہٴ وحی غیر متلوٰ۔ بعض احکامات کی تحلیل و تحریم کی نسبت براہِ راست اپنی طرف کی، تو بعض کی لہجائے نبوت کی طرف: وَهَذَا فَضْلُ اللَّهِ يُعْطِيهِ مَنْ يَشَاءُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔۔۔

۔۔۔ شاہ صاحب کی توجیہ کو یہ حدیث شریف قوت بخش رہی ہے۔

فتح مکہ کے دن حضور نبی کریم نے فرمایا۔۔۔

إِنَّ هَذَا الْبَلَدَ حَرَّمَ اللَّهُ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَوَاتِ
وَالْأَرْضَ فَهُوَ حَرَامٌ بِحُرْمَةِ اللَّهِ إِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ

۔۔۔ یعنی۔۔۔

اللہ تعالیٰ نے اس شہر کو اسی دن حرام فرمادیا تھا جبکہ زمین و آسمان کو پیدا فرمایا
(بتنا یہ ہے کہ اسکی تحریم امر قدیم ہے جیسا کہ مشکوٰۃ شریف کے حاشیہ
پر اس بات کی تصریح ہے) تو وہ قیامت تک کیلئے حرام بحرمۃ اللہ ہے

۔۔۔ لہذا 'اعلام و تبلیغ' مراد لینے والوں کے قول کی وہ تاویل کر دینی مناسب ہے جس
کی طرف شقِ رابع میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ میری اور شاہ صاحب کی توجیہوں کا مرکزی
خیال ایک ہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جہاں جہاں تحریم مکہ کی نسبت اللہ کی طرف
ہے وہاں وہ تحریم قدیم مراد لیتے ہیں اور میری توجیہ کا منشاء یہ ہے کہ تحریم مکہ بحرمۃ
اللہ سے مراد یا تو قیامت تک کیلئے بھائے تحریم ابراہیمی ہے۔۔۔ یا۔۔۔ تحریم کی نسبت
اللہ کی طرف اسلئے کر دی گئی ہے تاکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بارگاہِ الہی میں غایت

قرب ظاہر ہو اور یہ ظاہر ہو جائے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تحریم کسی عام انسان کی تحریم نہیں، بلکہ رب کی تحریم ہے۔ لہذا اس کے واجب التعمیل ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں۔۔۔ اس صورت میں اس حدیث سے بھی کوئی اشکال پیدا نہ ہوگا جس میں فرمایا گیا ہے۔۔۔

إِنَّ مَكَّةَ حَرَّمَهَا اللَّهُ وَلَمْ يُحَرِّمْهَا النَّاسُ

یعنی۔۔۔ مکہ کو اللہ نے حرام فرمایا ہے کسی انسان نے نہیں

۔۔۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ 'تحریم ابراہیمی' تو صرف ایک انسان کی تحریم ہے بھلا وہ کیسے واجب التعمیل ہو سکتی ہے۔ تو رب کی طرف نسبت کر کے یہ جواز دے دیا گیا کہ 'تحریم ابراہیمی' ان کے رب کی تحریم ہے اسکو یہ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ اس کو تو صرف ایک انسان نے حرام کیا ہے۔

'تحریم ابراہیمی' میں تحریم سے مراد دعائے تحریم ہے! اسکی تائید میں ممکن ہے کہ کوئی یہ کہے کہ حضور نے فرمایا ہے۔۔۔

اللَّهُمَّ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ عَبْدُكَ وَخَلِيلُكَ وَنَبِيُّكَ

وَأَنَا عَبْدُكَ وَنَبِيُّكَ وَأَنْتَ دَعَاكَ لِمَكَّةَ

وَأَنَا أَدْعُوكَ لِلْمَدِينَةِ بِمِثْلِ مَا دَعَاكَ لِمَكَّةَ

اے اللہ بیشک ابراہیم تیرے بندے اور خلیل و نبی ہیں

اور میں بھی تیرا بندہ و نبی ہوں۔ انھوں نے مکہ کیلئے تجھ سے

دعا کی تھی میں مدینہ کیلئے تجھ سے دعا کر رہا ہوں،

اسی قسم کی دعا جس طرح کی ابراہیم نے مکہ کیلئے کی تھی۔

اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابراہیم نے 'تحریم مکہ' کی صرف دعا کی تھی، خود تحریم نہیں فرمائی تھی۔ اسی طرح ہمارے نبی کریم ﷺ نے بھی تحریم مدینہ

کیلئے دعا فرمائی ہے۔۔۔۔ میں عرض کروں گا کہ مذکورہ بالا حدیث سے یہ نتیجہ نکالنے سے پہلے میری چند گزارشات کو ملحوظ خاطر رکھ لیا جائے۔

﴿اولاً﴾۔۔۔ دعائے ابراہیمی کے الفاظ یہ ہیں۔۔۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَكَآ اٰمِنًا وَّارْمُقِ اَهْلَكَ

مِنَ الشِّرْكِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ﴿البقرہ: ۱۲۶﴾

اور جب ابراہیم نے اللہ سے دعا کی، اے رب اس شہر مکہ کو امن والا شہر بنادے اور اس میں رہنے والے مومنین کو سچلوں کا رزق عطا فرما۔

۔۔۔ دیکھیے اس میں دعائے خیر و برکت ہے، نہ کہ دعائے تحریم۔ پتہ چلا کہ حدیث شریف میں جس دعا کا ذکر ہے وہ یہی دعائے خیر و برکت ہے۔

﴿ثانیاً﴾۔۔۔ حدیث شریف کے سیاق و سباق سے بھی صرف یہی پتہ چلتا ہے کہ حضور نے مدینہ شریف کیلئے خیر و برکت کی دعا کی تھی، جیسا کہ حضرت ابراہیم نے مکہ شریف کیلئے خیر و برکت کی دعا فرمائی تھی۔۔۔ الحاصل۔۔۔ اس حدیث میں 'تحریم' یا 'دعائے تحریم' کا کوئی سوال ہی نہیں۔ پوری روایت کے ابتدائی کلمات یہ ہیں:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ النَّاسُ إِذَا رَأَوْا أَوَّلَ الثَّمَرَةِ جَاءُوا بِهِ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ
فَإِذَا أَخَذَهُ قَالَ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِي ثَمَرِنَا وَبَارِكْ لَنَا فِي مَدِينَتِنَا
وَبَارِكْ لَنَا فِي صَاعِنَا وَبَارِكْ لَنَا فِي مُدِّنَا اَللّٰهُمَّ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ عَبْدَكَ
وَخَلِيْلَكَ وَنَبِيَّكَ وَاِنِّى عَبْدُكَ وَنَبِيُّكَ وَاِنَّهٗ دَعَاكَ لِمَكَّةَ
وَاَنَا دَعُوْكَ لِلْمَدِيْنَةِ بِمَثَلِ مَا دَعَاكَ لِمَكَّةَ ﴿مختلوة شریف﴾

حضرت ابو ہریرہ راوی ہیں کہ لوگوں کا دستور تھا کہ جب پہلا پھل دیکھتے تو بارگاہ رسالت میں لاتے۔ حضور اس کو دست مبارک میں لیکر یہ دعا فرمایا کرتے: اے اللہ ہمارے سچلوں، ہمارے شہر، ہمارے صاع اور

ہمارے مد میں برکتیں عطا فرما۔ اے اللہ بیشک ابراہیم تیرے بندے اور خلیل و نبی ہیں اور میں بھی تیرا بندہ و نبی ہوں۔ انھوں نے مکہ کیلئے تجھ سے دعا کی تھی، میں مدینہ کیلئے تجھ سے دعا کر رہا ہوں، اسی طرح کی دعا جس طرح کی ابراہیم نے مکہ کیلئے کی تھی۔

--- اس کے بعد حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا کہ حضرت نبی کریم ﷺ یہ دعا فرما کر لانے والے کے چھوٹے بچے کو طلب فرماتے اور اُس کو یہ پھل عطا فرما دیا کرتے۔ پوری حدیث کو دیکھنے کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ یہاں صرف دعائے خیر و برکت کا ذکر ہے۔ 'تحريم' یا 'دعائے تحريم' سے اس کا کوئی تعلق نہیں، ورنہ ہر بار نئے پھل کو ملاحظہ فرما کر اس دعا کے کیا معنی؟ کیا 'تحريم' یا 'دعائے تحريم' کوئی ایسی چیز ہے جس کا اعادہ ہر نئے پھل کو دیکھ کر ضروری ہے؟ لہذا ثابت ہو گیا کہ 'تحريم' ابراہیمی میں 'تحريم' سے 'دعائے تحريم' مراد لینے والوں کیلئے میرے فہم ناقص میں یہ حدیث مفید نہیں۔

﴿ ۸۱ ﴾ --- حضور نے فرمایا ہے:

إِنِّي أُحَرِّمُ مَا بَيْنَ لَابَتَيْ الْمَدِينَةِ
میں مدینہ کے سنگتوں کے مابین کو حرام کرتا ہوں

--- اور فرمایا۔۔۔

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ حَرَّمَ مَكَّةَ فَجَعَلَهَا حَرَامًا وَإِنِّي حَرَّمْتُ الْمَدِينَةَ
ابراہیم نے مکہ کی تحریم کی تو انھوں نے اس کو حرام بنا دیا اور میں نے مدینہ کو حرام کر دیا

--- اور فرمایا۔۔۔

اللَّهُمَّ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ حَرَّمَ مَكَّةَ وَإِنِّي أُحَرِّمُ مَا بَيْنَ لَابَتَيْهَا
اے اللہ ابراہیم نے مکہ کو حرام کیا اور میں مدینہ کے سنگتوں کے مابین کو حرام کرتا ہوں

--- حضرت سلیمان بن ابوعبداللہ نے فرمایا:

حَرَّمَ الْمَدِينَةَ الَّتِي حَرَّمَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ

حرم مدینہ جس کو رسول اللہ ﷺ نے حرام فرمایا

-- انھوں نے حضرت سعد ابن وقاص رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل فرمایا:

إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ حَرَّمَ هَذَا الْحَرَّمَ

اس حرم کو رسول اللہ ﷺ نے حرام فرمایا ہے

-- ان احادیث و آثار میں تحریم کی نسبت غیر مبہم لفظوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام

اور حضور نبی کریم ﷺ کی طرف کی گئی ہے اور انکے حقیقی معنی مراد لینے میں کوئی قباحت

بھی نہیں، تو معنی حقیقی سے عدول کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

-- بعض حدیثوں کے الفاظ اس طرح کے بھی ملتے ہیں:

حَرَّمَ مَا بَيْنَ لَا بَتَّى الْمَدِينَةِ عَلَى لِسَانِي

مدینہ کے دونوں سنگستانوں کا درمیانی حصہ میری زبان پر حرم ہو گیا (یا۔۔ حرم بنا دیا گیا)

إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى حَرَّمَ عَلَى لِسَانِي مَا بَيْنَ لَا بَتَّى الْمَدِينَةِ

اللہ تعالیٰ نے مدینہ کے دونوں سنگستانوں کے درمیانی حصہ کو میری زبان پر حرام کر دیا

-- ان حدیثوں میں 'حرمت و تحریم' کی نسبت اللہ کی طرف دیکھ کر کوئی یہ نتیجہ نہ

نکا لے کہ یہ 'حرمت و تحریم' بذریعہ سیدنا جبرائیل امین ہوئی ہے۔ اس لئے کہ یہ ایسا دعویٰ

ہوگا کہ جس کی دلیل نہیں۔ چونکہ تبلیغ کا حکم، اعلان کا امر، اور تشریع کا اذن، نیز اس

کے علاوہ رسول کریم ﷺ جتنے صفات و کمالات کے حامل ہیں، وغیرہ وغیرہ سب کچھ

اللہ تعالیٰ ہی کے فضل و عطا سے ہیں۔ اسی کی قدرت دینے سے ہیں۔ تو اس سبب

سے اگر 'حرمت و تحریم' کی نسبت اللہ کی طرف کر دی گئی (جو 'حرمت و تحریم' کا اذن

دینے والا ہے) تو یہ بارگاہ الہی میں نبی کریم ﷺ کا کمال ادب ہوا۔ اس سے یہ لازم

نہیں آتا کہ جن حدیثوں میں تحریم یا حرمت کی نسبت براہِ راست نبی کریم ﷺ کی طرف ہو وہاں اسکے 'حقیقی' معنی مراد نہ ہوں۔ اور نہ یہی لازم آتا ہے کہ وہ اپنی حرام کردہ چیزوں کی 'حرمت و تحریم' کی نسبت بطور تحدیثِ نعمت اپنی طرف نہ کریں۔۔۔ بالفرض۔۔۔ اگر ان حدیثوں کا یہ مطلب لیا جائے کہ رسول کے ذریعہ اللہ نے حرمت کا اعلان کر دیا ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ بذریعہ سیدنا جبرائیل علیہ السلام اس اعلان کا حکم دیا ہو۔ بلکہ اسکا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ 'تشریعِ قدیم' میں اللہ نے اسکی 'تحریم' فرمادی تھی اور اُس 'حکمِ قدیم' کا اعلان 'تفویضِ احکام' کا حق دیکر رسول کے ذریعہ کرایا۔ اس معنی میں رسول کا مبلغ و معلم ہونا انکے تشریعی اختیارات کے منافی نہیں۔ ان تمام تفصیلات کا حاصل یہ ہے کہ 'حرمت و تحریم' مکہ و مدینہ سے متعلق جتنی حدیثیں میں نے تحریر کی ہیں اور اس معنی میں اور جو دوسری حدیثیں ہیں ان سب میں تاویلات کی کافی گنجائش ہے اور دلائل ہر ہر تاویل کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں ہر تاویل اپنی جگہ پر حجت ہے۔ لہذا نہ تو ان احادیث کو نبی کریم ﷺ کے اختیاراتِ تشریعی کی نفی میں پیش کر سکتے ہیں اور نہ ہی انکی بنیاد پر اتنا بڑا دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ جہاں جہاں تحریم کی نسبت نبی کریم ﷺ کی طرف ہوگی، وہاں صرف 'دعائے تحریم' یا وہ 'تبلیغ و اعلام' ہی مراد ہوگا، جسکا حکم بذریعہ سیدنا جبرائیل علیہ السلام دیا گیا ہو۔ بلکہ جو تاویل رسول کریم ﷺ کے 'اختیاراتِ تشریعی' کو ثابت کرنے والی ہوگی اسکو اسکے ماسوا پر ترجیح حاصل ہے۔ اسلئے کہ 'اصول فقہ' میں یہ بات طے ہو چکی ہے کہ۔۔۔

الْمُثْبِتُ أَوْلَى مِنَ النَّافِي ﴿نور الانوار﴾

ثابت کرنے والے دلائل نفی کرنے والے دلائل پر ترجیح رکھتے ہیں

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَمَا يَكْفُرُ

وَالسَّامِعِ
عَلَيْهِ السَّلَامُ
صَلَّى اللَّهُ

بِسْمِهِ سُبْحَانَهُ
التَّحْقِيقُ الْبَارِعُ فِي حُقُوقِ الشَّارِعِ

رسول اکرم
ﷺ کے

تشریحی اختیارات

تالیف

محدث اعظم ہند، حضرت علامہ سید محمد اشرفی جیلانی، کچھوچھوی ﷺ

استفتاء

﴿۱﴾۔۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلے میں کہ۔۔ نماز
مکمل نہ فرض ہیں۔ اس میں سے تین وقت کی نماز آنحضرت ﷺ نے کس صحابی کو معاف
فرمادی۔ یہ کس حدیث میں ہے اور (کیا) وہ اس مرتبہ کی ہے کہ قرآن شریف کی
نسخ ہو سکتی ہے یا نہیں؟

﴿۲﴾۔۔ کیا رسول اللہ ﷺ کو یہ اختیار ہے کہ جس چیز کو چاہیں حلال فرمادیں اور جس
چیز کو چاہیں حرام فرمادیں؟ یہ اختیار کس آیت اور حدیث میں ہے؟ حضرات شیعہ اپنے
ائمہ کو بھی یہی اختیار دیتے ہیں۔ یہ اہلسنت والجماعت کے نزدیک صحیح ہے یا نہیں؟

يَبْنُوْا اِلَى الْكِتَابِ نُوْجِرُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ -

(مستفتی) محمد عبدالرحمن ڈھانگڑو، جون پور

تاریخ ۱۵/۱/۱۹۳۸ء

الجواب اللّٰهم هداية الحق والصّواب

﴿۱﴾۔۔۔ مسند امام احمد رحمۃ اللہ علیہ میں ایسی سند ہے جسکے تمام راوی ثقہ اور رجال صحیح مسلم رحمۃ اللہ علیہ سے ہیں یہ حدیث مروی ہے کہ:

حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ جَعْفَرٍ نَشَأَ شُعْبَةً عَنْ قَتَادَةَ عَنْ
نَصْرِ بْنِ عَاصِمٍ عَنْ رَجُلٍ مِنْهُمْ أَنَّهُ أَتَى النَّبِيَّ ﷺ فَاسْلَمَ
عَلَى أَنَّهُ لَا يُصَلِّي إِلَّا صَلَاتَيْنِ فَقَبِلَ ذَلِكَ مِنْهُ۔

۔۔۔ یعنی۔۔۔

ایک شخص نبی ﷺ کے پاس حاضر ہو کر اس شرط
پر ایمان لائے کہ صرف دو ہی نمازیں پڑھا کروں گا،
حضور ﷺ نے اس کو قبول فرمایا۔

ایسے نواقعات کی فہرست مجمل طور پر کتاب مستطاب "انْمُودَجُ اللَّيْبِ
فِي خَصَائِصِ الْحَبِيبِ"، میں امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے درج کی ہے
کذا فی الامن والعلی للمجدد للمائة الحاضرة۔ اس قسم کے واقعات میں
نسخ ^۹ کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ان واقعات کا خلاصہ یہ ہے کہ بعض احکام شریعت
سے لوگوں کو نبی کریم ﷺ نے مستثنیٰ فرمایا۔ اور جو چیز تمام امت پر فرض تھی اور ہے یا
حرام تھی اور ہے، وہ حکم اس شخص خاص کیلئے نہ رہا۔ اسی طرح اس قسم کے واقعات کی
روایات میں ایسی قوت کا دیکھنا جو ناخ قرآن شریف ہو سکے، بڑی بے علمی کی بات
ہے، کیونکہ اوّل تو یہ موقع نسخ کا نہیں۔ دوسرے اگر نسخ ہی مان لیا جائے، تو اصل ناخ
اس شخص ^۹ کیلئے جسکے حق میں نسخ ہوا وہ ارشاد ہے جو لب پاک مصطفیٰ نے فرمایا اور اس
شخص نے خود اپنے کانوں سے اس ارشاد کو سنا جس میں راویوں کا کوئی واسطہ نہیں، تو

اس شخص کیلئے وہ ارشادِ نبوی حجتِ قطعیہ سے ہو گیا، جس سے بڑھ کر اور قوی تر شریعتِ مطہرہ میں کوئی دلیل ہی نہیں۔ البتہ اس واقعہ کی روایت ہم لوگوں تک راویوں کے ذریعہ سے پہنچی اور اس روایت میں ہم لوگوں کے حق میں اسکے سوا کچھ نہیں ہے کہ نبی کریم ﷺ کو اختیار تھا کہ جس کو چاہیں اور جس حکم سے چاہیں مستثنیٰ فرمادیں۔ یہ بات ہمارے نبی کریم ﷺ کے فضائل و خصائص سے ہے۔ اور بابِ فضائل میں حدیث مذکور بلا فتنہ منکر حجتِ ۱۱ ہے۔

واللہ ورسولہ اعلم

﴿ ۲ ﴾۔۔۔ قرآن کریم میں فرمایا:

۔۔۔ پہلی آیت:

۔۔۔ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً مِّنَ رَبِّكَ وَمَا تَنذِرُكَ وَمَا تَنْهَىٰ عَنْهُ فَانْتَهَىٰ ۚ

جو حکم وغیرہ رسول تم کو دیں، اس کو اختیار کرو اور جس سے روکیں اس سے باز رہو۔

۔۔۔ اور اس آیہ کریمہ کے متعلق ہمالیہ پہاڑ سے زیادہ بھاری حجتِ مستقی پر یہ کہ اسکے پیشوا مولوی اشرف علی تھانوی کو بھی اپنے ترجمہ قرآن میں تسلیم کرنا پڑا ہے کہ اس آیت سے احکامِ شریعت میں بھی اختیارِ نبوی ثابت ہوتا ہے۔

۔۔۔ دوسری آیت:

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الَّذِي يَخْدُوكُم مَّا كُنْتُمْ يَدْعُونَ
عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ

عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُخْلِئُ لَهُمُ الطَّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْفَبَاتِ ۚ

جو لوگ پیروی کرتے ہیں اس نبی ءامی کی، جس کو پاتے ہیں لکھا ہوا اپنے نزدیک توریت و انجیل میں۔ جو ان کو حکم دیتا ہے نیکی کا اور روکتا ہے ان کو برائی سے اور حلال فرماتا ہے ان کیلئے پاکیزہ چیزوں کو اور حرام فرماتا ہے ان پر ناپاکیوں کو۔

--- تیسری آیت:

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ

وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ

لڑو ان سے جو نہیں مانتے اللہ کو اور پچھلے دن کو اور نہیں حرام جانتے جس کو حرام کر دیا اللہ نے اور حرام کر دیا رسول اللہ نے۔ ﴿صاف القرآن﴾

--- چوتھی آیت:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا لِمُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ

أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ

اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا

کوئی حق نہیں کسی مسلمان مرد و عورت کو جبکہ حکم دے اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا کہ ان کیلئے کچھ اختیار رہے اپنے امر سے اور جو حکم نہ مانے اللہ کا اور جو حکم نہ مانے رسول اللہ کا وہ بلاشبہ گھلی ہوئی گمراہی میں بہک گیا ہے۔ ﴿صاف القرآن﴾

--- یہ شتے نمونہ چند آیات ہیں جن میں قرآن عظیم نے صاف صاف فرمایا کہ رسول اللہ کا ہر حکم تشریفی واجب التعمیل ہے۔ وہ جو چاہیں حکم دیں اور جس چیز سے چاہیں روک دیں۔ رسول اللہ ﷺ حلال فرماتے ہیں اور حرام فرماتے ہیں۔ جس چیز کو رسول اللہ ﷺ حرام فرمادیں جو اس کو حرام نہ مانے اس سے جہاد کا حکم ہے۔ جس چیز کا رسول اللہ ﷺ حکم دیں اسکو نہ ماننے کا کسی کو اختیار نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے فرمان کو جو نہ مانے وہ سخت گمراہ ہے۔ ان آیات کریمہ میں سے پچھلی آیت کا شان نزول یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے غلام آزاد حضرت زید ابن حارثہ رضی اللہ عنہ کے نکاح کا پیغام اپنی پھوپھی زاد بہن، حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے دیا، جس سے انھوں نے

اور انکے بھائی عبداللہ ابن جحش ؓ نے اس بنا پر انکار کر دیا کہ حضرت زید ؓ انکے کفو نہ تھے۔ اور شرعاً عورت کو حق حاصل ہے کہ اس بارے میں انکار کر سکے، خصوصاً جبکہ اسکے خاندان کی شرافت ثریا سے بھی بالاتر ہو۔ مگر اس پیام کے نہ ماننے پر اللہ رب العزت نے وہ الفاظ ارشاد فرمائے، جو اللہ کے فرض کئے ہوئے کسی کام کو نہ ماننے پر فرمائے جاتے۔ اور پھر اسکے ساتھ آیہ کریمہ میں اپنا نام پاک بھی شامل فرما دیا کہ ہم نے کسی عورت پر فرض نہیں فرمایا کہ خواہ مخواہ کسی سے نکاح کرنے پر راضی ہو جائے۔ لیکن جب ہمارے رسول نے فرما دیا تو وہ ہمارا ہی فرمانا ہو گیا اور وہ بات قطعی ہو گئی اور مسلمانوں کو اسکے نہ ماننے کا کچھ اختیار نہ رہا۔ اس بناء پر ہمارے ائمہ دین خدا و رسول کے فرض میں یہ فرق کرتے ہیں کہ رسول کا فرض کیا ہوا قوی ہے اور خدا کا فرض کیا ہوا 'اقوی' ہے۔

احکام شریعت حضور ؐ کے سپرد ہیں، وہ جو کچھ چاہیں واجب کر دیں اور جو کچھ چاہیں ناجائز کر دیں اور جس کو جس حکم سے چاہیں مستثنیٰ فرمادیں۔ میزان امام شعرانی، باب الوضوء میں، حضرت سیدی علی خواص ؒ سے منقول ہے۔۔۔

كَانَ الْإِمَامُ أَبُو حَنِيفَةَ ؒ مِنْ أَكْثَرِ الْأَئِمَّةِ أَذْبَاعَ اللَّهِ تَعَالَى وَلِذَلِكَ لَمْ يَجْعَلِ النِّيَّةَ فَرَضًا وَسَمَّى الْوُتْرَ وَاجِبًا لِكُونِهِمَا تَبَاتُ السُّنَّةِ لَا بِالْكِتَابِ فَقَصَّدَ بِذَلِكَ تَمْيِيزَ مَا وَجِبَهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَإِنَّ مَا فَرَضَهُ اللَّهُ تَعَالَى أَشَدُّ مِمَّا فَرَضَهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مِنْ ذَاتِ نَفْسِهِ حِينَ خَيَّرَهُ اللَّهُ تَعَالَى أَنْ يُوجِبَ مَا شَاءَ أَوْ لَا يُوجِبَ

یعنی۔۔۔

امام اعظم ابو حنیفہ ؒ ان اکابر ائمہ میں سے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اوروں سے زیادہ ادب ہے۔ چنانچہ انھوں نے وضو میں نیت کو فرض ؑ نہ کہا اور نماز وتر کو واجب کہا، کیونکہ یہ دونوں چیزیں حکم نبوی سے

ہیں، چنکا قرآن میں حکم نہیں۔ اس طریقہ سے انھوں نے اللہ تعالیٰ کے فرض کئے ہوئے اور رسول اللہ ﷺ کے واجب کئے ہوئے میں فرق کر دیا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرض کیا ہوا 'اقویٰ' ہے، اُس سے جس کو حضور ﷺ نے اپنی طرف سے فرض کیا ہو۔ جبکہ یہ اختیار حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے ہی دیا تھا کہ جس بات کو چاہیں واجب کر دیں اور جسے ناچاہیں نہ کریں۔

۔۔۔ امام شعرانی نے اس اصل کی بنا پر احکام کی چند مثالیں دیتے ہوئے فرمایا:

’كَانَ الْحَقُّ تَعَالَى جَعَلَ لَهُ ﷺ أَنْ يُشَرَّعَ مِنْ قَبْلِ نَفْسِهِ مَا شَاءَ كَمَا فِي حَدِيثِ تَحْرِيمِ شَجَرِ مَكَّةَ فَإِنَّ عَمَّهُ الْعَبَّاسُ ﷺ لَمَّا قَالَ لَهُ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِلَّا الْإِذْخِرُ^{۱۶} فَقَالَ ﷺ إِلَّا الْإِذْخِرُ وَلَوْ أَنَّ اللَّهَ تَعَالَى لَمْ يَجْعَلْ لَهُ أَنْ يُشَرَّعَ مِنْ قَبْلِ نَفْسِهِ لَمْ يَتَجَرَأُ ﷺ أَنْ يَسْتَشْنِي شَيْئًا مِمَّا حَرَّمَ اللَّهُ تَعَالَى‘

۔۔۔ یعنی۔۔۔

حق تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو حق دیا تھا کہ اپنی جانب سے جو چاہیں شریعت مقرر کریں۔ جیسا کہ حرم مکہ معظمہ کے درخت اور گھاس سے اذخر گھاس کو، جب حضرت عباس نے عرض کیا کہ مستثنیٰ فرما دیجئے، تو حضور نے اس کو مستثنیٰ فرما دیا کہ اس کا ٹانجا نر ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے شریعت مقرر فرمانے کا حق آنحضرت ﷺ کو نہ دیا ہوتا تو آنحضرت ﷺ اس بات کی جرأت نہ فرماتے کہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے حرام فرما دیا ہے اس میں سے کچھ بھی مستثنیٰ فرمائیں۔

امام شعرانی نے جس حدیث کا تذکرہ فرمایا ہے وہ حدیث صحیح بخاری صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور اسی صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ

سے۔۔۔ نیز۔۔۔ سنن ابن ماجہ میں حضرت صفیہ بنت شیبہ رضی اللہ عنہا سے یہ سند صحیح مروی ہے۔ 'میزان الشریعۃ الکبریٰ' میں قانون شریعت کی چند قسمیں بتائی ہیں۔ ایک وہ جس کیلئے وحی آئی ہے۔۔۔ اور۔۔۔

الْثَّانِي مَا أَبَاحَ الْحَقُّ تَعَالَى لِنَبِيِّهِ ﷺ أَنْ يَسْنَنَهُ عَلَى رَأْيِهِ هُوَ كَتَحْرِيمِ لُبْسِ الْحَرِيرِ عَلَى الرِّجَالِ وَقَوْلُهُ فِي حَدِيثِ تَحْرِيمِ مَكَّةَ إِلَّا الْإِذْحِرُوا لَوْلَا أَنَّ اللَّهَ كَانَ يُحَرِّمُ جَمِيعَ نَبَاتِ الْحَرَمِ لَمْ يُسْتَيْشَنَّ ﷺ الْإِذْحِرُ وَنَحْوُ حَدِيثِ لَوْلَا أَنْ أَشَقُّ عَلَى أُمَّتِي لَا خَرْتُ الْعِشَاءَ إِلَى ثُلُثِ اللَّيْلِ وَنَحْوُ حَدِيثِ لَوْ قُلْتُ نَعَمْ لَوْ جَبْتُ وَلَمْ تَسْتَطِيعُوا فِي جَوَابِ مَنْ قَالَ لَهُ فِي فَرِيضَةِ الْحَجِّ أَكُلْ عَامٌ يَارَسُولَ اللَّهِ قَالَ لَا وَلَوْ قُلْتُ نَعَمْ لَوْ جَبْتُ وَقَدْ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يُخَفِّفُ عَلَى أُمَّتِهِ وَيُنْهَاهُمْ عَنْ كَثْرَةِ السُّؤَالِ وَيَقُولُ أَتُرْكُونِي مَا تَرَكَتُكُمْ - آه باختصار -

۔۔۔ یعنی۔۔۔

شریعت کی دوسری قسم وہ ہے کہ حق تعالیٰ نے نبی ﷺ کو اجازت دیدی کہ اپنی رائے سے جو طریقہ چاہیں قائم فرمائیں۔۔۔ مثلاً: مردوں کو ریشم پہننے کو آنحضرت ﷺ کا حرام فرمادینا اور تحریم مکہ کی حدیث میں اذخر گھاس کو مستثنیٰ فرمادینا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے مکہ کی ہر جڑی بوٹی کا کائنا حرام نہ فرمادیا ہوتا تو اذخر کو مستثنیٰ کرنے کی کیا حاجت تھی؟ اور مثلاً آنحضرت ﷺ کا یہ فرمانا کہ اگر میری امت پر بوجھ نہ ہو جاتا تو میں نماز عشاء کے وقت کو تہائی رات تک ہٹا دیتا۔ اور۔۔۔ مثلاً: جب حضور فریضہ حج بیان فرما رہے تھے اور کسی نے پوچھا کہ کیا ہر سال حج فرض ہے یا رسول اللہ؟ تو حضور کا

فرمانا کہ نہیں۔ اور اگر میں ہاں کہہ دوں تو ہر سال واجب ہو جائے اور تم نہ کر سکو۔ آنحضرت ﷺ کی عادت کریمہ تھی کہ اپنی امت پر آسانی فرماتے اور ان کو زیادہ سوال کرنے سے روکتے اور فرماتے کہ مجھ کو چھوڑے رکھو، جب تک تم کو کسی حکم سے آزا رکھوں۔

امام کی عبارت بالا میں نماز عشاء کے مؤخر فرمانے کی جو حدیث ہے اس کو متعدد محدثین نے روایت کیا ہے۔ چنانچہ 'معجم کبیر'، 'طبرانی' میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے اور مسند امام احمدؒ و سنن ابوداؤدؒ و ابن ماجہؒ و غیر ہاں میں حضرت ابوسعید خدریؓ سے وہ حدیث مروی ہے اور وہ حدیث جس میں فرمایا کہ، اگر میں ہاں فرما دوں تو ہر سال حج فرض ہو جائے، متعدد کتب صحاح میں موجود ہے۔ چنانچہ مسند امام احمدؒ و صحیح مسلمؒ و نسائیؒ میں حضرت ابو ہریرہؓ سے اور مسند امام احمدؒ، ترمذیؒ و ابن ماجہؒ میں، حضرت امیر المومنین مولیٰ علیؑ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم سے اور مسند امام احمدؒ و 'دارمی' و نسائیؒ میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے اور ابن ماجہؒ میں حضرت انسؓ ابن مالکؓ سے مروی ہے اور 'میزان' کا پچھلا مضمون، کہ مجھے چھوڑے رہو جب میں تم کو آزا رکھوں، یہ بھی صحیح مسلمؒ و سنن نسائیؒ میں اس حدیث ابو ہریرہؓ کے ساتھ ہے جس میں فرمایا کہ:

لَوْ قُلْتُ نَعَمْ لَوَجَبَتْ وَلَمَّا اسْتَطَعْتُمْ

اگر میں کہہ دیتا کہ ہاں، تو حج ہر سال واجب ہو جاتا اور تم نہ کر سکتے

-- پھر فرمایا: دَرُونِي مَا تَرَكْتُكُمْ فَإِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بَكْرَةً سَوَاءٌ لَهُمْ وَاجْتِلَا فِيهِمْ عَلَى أَنْبِيَائِهِمْ فَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ فَأَتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَإِذَا نَهَيْتُكُمْ عَنْ شَيْءٍ فَدَعُوهُ 'مجھے چھوڑے رہو جب میں تمہیں آزا رکھوں کہ پہلی امتیں ہلاک

ہوئیں زیادہ پوچھنے اور اپنے انبیاء کے خلاف منشاء چلنے سے۔ تو میں تم کو جس چیز کا حکم دوں، حتی الامکان اس کو انجام دو اور جب میں تم کو کسی چیز سے روکوں، تو اس کو چھوڑ دو۔

--- اسکو ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے۔ حدیث کا یہ ٹکڑا تفسیر ہے، اس آئیہ کریمہ کی جس سے جواب دوم شروع کیا گیا ہے۔۔۔ کہ:

--- وَمَا أَمَرَ الرُّسُلَ فَعَدُّوا وَمَا نَهَى عَنْهُ فَانْتَهُوا ---

رسول جس بات کا حکم دیں، اسکی تعمیل کرو اور جس سے روک دیں، اس سے باز رہو
وللہ الحجة السامیہ

--- امام احمد قسطلانی 'مواہب لدینی' میں فرماتے ہیں:

مَنْ خَصَّاصِهِ بِأَنَّهُ يَخُصُّ مَنْ شَاءَ بِمَا شَاءَ مِنَ الْأَحْكَامِ
آنحضرت ﷺ کے خصائص سے ہے کہ جس سے جس حکم کو چاہیں خاص فرمادیں۔

--- امام جلال الدین سیوطی نے خصائص کبریٰ میں ایک باب وضع فرمایا:

بَابُ اخْتِصَاصِهِ بِأَنَّهُ يَخُصُّ مَنْ شَاءَ بِمَا شَاءَ مِنَ الْأَحْكَامِ

باب اس بیان میں کہ آنحضرت ﷺ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ جس حکم سے جس کو چاہیں خاص فرمادیں۔

--- امام قسطلانی نے اس کی نظیر میں پانچ واقعات ذکر کئے، امام سیوطی نے اس پر مزید پانچ کا اضافہ کیا اور حضرت مجدد مانتہ حاضرہ نے پندرہ بڑھائے۔ میں ان میں سے چند واقعات بلا نقل عبارت، بخیال اختصار، نقل کرتا ہوں اور ہر ایک کا حوالہ دیتا ہوں، تاکہ جو چاہے اصل کتاب سے، اصل عبارت کو دیکھ لے۔

پہلی نظیر: حضرت ابو بردہ رضی اللہ عنہ کیلئے چھ مہینہ کی بکری کی قربانی آنحضرت ﷺ

نے جائز فرمادی اور فرمایا لَمْ تُخْزِ عَنْ أَحَدٍ بَعْدَكَ، یعنی آج یہ اجازت سواتمہارے کسی کیلئے نہیں ہے۔ 'ارشاد الساری'، 'شرح صحیح بخاری' میں اس حدیث کے نیچے ہے

خَصُوصِيَّةً لَا تَكُونُ لِغَيْرِهِ إِذْ كَانَ لَهُ ﷺ أَنْ يُخَصَّ مَنْ شَاءَ بِمَا شَاءَ مِنَ الْأَحْكَامِ
--- یعنی --- آنحضرت ﷺ نے یہ خصوصیت حضرت ابو بردہ رضی اللہ عنہ کو عطا فرمائی جو دوسروں
کیلئے اس حکم کی بنا پر نہیں ہے۔ کیونکہ آپ کو اختیار تھا کہ جسے چاہیں خاص فرمادیں۔
حدیث مذکور بخاری و مسلم میں حضرت براء ابن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

دوسری نظیر: ایک بار حضرت عقبہ ابن عامر کو بھی ششماہی بکری کی قربانی کی
اجازت آنحضرت ﷺ نے عطا فرمائی۔ یہ حدیث بخاری شریف و مسلم شریف و سنن
بیہقی میں مروی ہے۔ حضرت شیخ محقق مولانا عبدالحق محدث دہلوی قدس سرہ اشعۃ
اللمعات، شرح مشکوٰۃ میں اس حدیث کے نیچے فرماتے ہیں، 'احکام مفوض بود
بہوے'، یعنی شریعت سپرد تھی آنحضرت ﷺ کے۔

تیسری نظیر: حضرت ام عطیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو ایک جگہ نوحہ کرنے کی رخصت
آنحضرت ﷺ نے دی۔ یہ حدیث صحیح مسلم و سنن نسائی و ترمذی و مسند امام احمد میں مروی
ہے۔ امام نووی اس حدیث کے نیچے فرماتے ہیں، 'لِلشَّارِعِ أَنْ يُخَصَّ مِنَ الْعُمُومِ
مَا شَاءَ'، یعنی شارع اللہ ﷺ کو اختیار ہے کہ عام حکموں سے جو چاہیں خاص فرمادیں۔

چوتھی نظیر: ایک بار حضرت خولہ بنت حکیم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو بھی آنحضرت ﷺ
نے نوحہ کی اجازت فرمائی۔ اس واقعہ کو ابن مردویہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ
عنہما سے روایت کیا ہے۔

پانچویں نظیر: ایک بار حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو عدت و وفات
شوہر کا سوگ آنحضرت ﷺ نے معاف فرمادیا۔ یعنی چار مہینہ دس دن کے سوگ کو جو
واجب ہے، ان کیلئے صرف تین دن کا سوگ رکھا۔ یہ واقعہ طبقات ابن سعد میں ہے۔
چھٹی نظیر: ایک بار حضرت اسماء بنت یزید انصاریہ کو بھی نوحہ کرنے کی اجازت
آنحضرت ﷺ نے دی۔ یہ حدیث ترمذی شریف میں ہے۔

ساتویں نظیر: ایک مرتبہ ایک صحابی کو مہر کی جگہ صرف سورہ قرآن سکھا دینا کافی فرمادیا اور فرمایا: لَا يَكُونُ لَكَ بِعَدْلِكَ مَهْرًا، یعنی تیرے سوا اور کسی کیلئے یہ مہر کافی نہیں۔ یہ واقعہ ابن السکن، میں حضرت ابو العثمان از دی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

آٹھویں نظیر: ایک مرتبہ حضرت خزیمہ ابن ثابت رضی اللہ عنہ کی گواہی کو ہمیشہ کیلئے شہادت کا نصاب کامل فرمادیا اور آئیہ کریمہ: **وَأَشْهِدُوا ذُو كُنَى عَدْلًا مِّنكُمْ**، سے انکو مستثنیٰ فرمادیا۔ یہ حدیث ابوداؤد و نسائی و ابن ماجہ و مصنف ابن ابی شیبہ و تاریخ بخاری و مسند ابویعلیٰ و صحیح ابن خزیمہ و معجم کبیر طبرانی وغیرہ میں موجود ہے۔

نویں نظیر: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کیلئے روزہ کا کفارہ، یوں جائز فرمادیا کہ اپنے پاس سے اُن کو سوا دو من کھجوریں عطا فرمائیں اور فرمادیا کہ خود کھاؤ اور اپنے گھر والوں کو کھاؤ، تمہارا کفارہ ادا ہو گیا۔ یہ حدیث صحاح ستہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اور صحیح مسلم میں اُمّ المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اور مسند بزاز و معجم اوسط طبرانی میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور دارقطنی میں حضرت امیر المؤمنین مولیٰ علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ ہدایہ میں بھی یہ حدیث موجود ہے اور سنن ابوداؤد میں حضرت امام زہری سے منقول ہے۔ **إِنَّمَا كَانَ هَذِهِ رُخْصَةً وَلَوْلَا رُخْصَلَا فَعَلَّ ذَلِكَ الْيَوْمَ لَمْ يَكُنْ لَهُ بُدٌّ مِنَ التَّكْفِيرِ**، یعنی یہ اجازت خاص اسی شخص کیلئے تھی۔ اگر آج کسی پر کفارہ واجب ہو تو کفارہ ادا کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ امام جلال الدین سیوطی وغیرہ نے بھی ایسا ہی فرمایا ہے۔

دسویں نظیر: ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جوان صحابی حضرت سالم کو اجازت دیدی کہ ایک بی بی صاحبہ کا دودھ پی لیں اور اسی سے حرمت رضاعت ثابت فرمادی۔ اس واقعہ کو صحیح مسلم و سنن نسائی و ابن ماجہ و مسند امام احمد میں روایت کیا ہے۔ اُمّ المؤمنین ام سلمہ و دیگر ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ: **مَنَّا رُيْ هَذِهِ**

الْأَرْحُصَةُ أَرْحُصَهَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لِسَالِمٍ خَاصَّةً، یعنی ہمارا یہی اعتقاد ہے کہ آنحضرت ﷺ نے خاص سالم ہی کو اس کی اجازت دی تھی۔ نیز یہ حدیث طبقات ابن سعد و حاکم میں بھی موجود ہے۔

گیا رہویں نظیر: آنحضرت ﷺ نے حضرت عبدالرحمن ابن عوف اور حضرت زبیر ابن عوام رضی اللہ عنہما کو جنگے بدن میں سوکھی کھجلی تھی، ریشمین کپڑے پہننے کی اجازت عطا فرمادی۔ یہ حدیث صحاح ستہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

بارہویں نظیر: آنحضرت ﷺ نے امیر المومنین مولیٰ علیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کو جنابت کی حالت میں بھی مسجد نبوی میں رہنا جائز فرمادیا۔ اس حدیث کو ترمذی و ابویعلیٰ و بیہقی نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور مستدرک و حاکم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے امیر المومنین عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا اسکے متعلق بیان نقل فرمایا ہے۔

تیرہویں نظیر: مخدرات اہل بیت پاک کو آنحضرت ﷺ نے بحالت عذر ماہانہ مسجد نبوی میں آنا جائز فرمادیا۔۔۔ یہ حدیث ’معجم کبیر‘، ’طبرانی‘ و ’سنن بیہقی‘ و ’تاریخ ابن عساکر‘ میں ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے۔

چودھویں نظیر: آنحضرت ﷺ نے حضرت برّ ابن عازب رضی اللہ عنہ کو سونے کی انگوٹھی پہننے کی اجازت فرمادی۔ یہ واقعہ ابن ابی شیبہ نے بہ صحیح ابوالسفر سے روایت کیا ہے۔ پندرہویں نظیر: آنحضرت ﷺ کی اجازت سابقہ سے حضرت سراقہ کو امیر المومنین حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے سونے کے کنگن پہنائے۔ یہ حدیث ’دلائل النبوة‘ و ’بیہقی‘ میں مروی ہے۔

سولہویں نظیر: آنحضرت ﷺ نے امیر المومنین حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو بغیر حاضری جہاد، مال غنیمت کا مستحق فرمادیا اور عطا فرمایا۔ یہ حدیث ’صحیح بخاری‘ و ’ترمذی‘

وَمُسْنَدُ إِمَامِ أَحْمَدُ فِي حَضْرَةِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔
 سترھویں نظیر: آنحضرت ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنی رعایا سے
 تحفہ لینا، جو سب کیلئے حرام ہے حلال فرمادیا۔ یہ واقعہ کتاب الفتح میں منقول ہے۔
 انیسویں نظیر: آنحضرت ﷺ نے صرف امیر المومنین مولیٰ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب تکرم
 کو اجازت دی کہ اپنے بیٹے کا نام اور کنیت وہ رکھیں جو حضور کا نام اور کنیت ہے۔
 اس حدیث کو امام احمد و ابوداؤد و ترمذی و ابویعلیٰ و حاکم و طحاوی و بیہقی وغیرہ
 نے روایت کیا ہے۔

بیسویں نظیر: آنحضرت ﷺ نے ایک صحابیہ کو احرام میں شرط لگانا جائز
 فرمادیا کہ جب اشائے حج میں معذور ہو جانا تو احرام سے نکل جانا، حالانکہ یہ کسی
 دوسرے کیلئے جائز نہیں ہے۔ یہ حدیث صحیح بخاری و صحیح مسلم میں مسند امام احمد و
 سنن نسائی و صحیح ابن حبان میں ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اور مسند امام
 احمد و صحیح مسلم و ابوداؤد و ترمذی و ابن ماجہ و ابن خزیمہ و ابولعیم و بیہقی میں حضرت
 ضیاء بنت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اور بیہقی و ابن مندہ میں حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ
 سے مروی ہے۔

اور اس قسم کی حدیثیں جن میں حضور نے فرمایا، کہ اگر امت پر گرانی کا خیال
 نہ ہوتا، تو میں ہر نماز میں مسواک کرنا واجب کر دیتا یا نماز عشاء کا وقت تمہاری رات تک
 ہٹا دیتا یا صحابہ کا بیان کہ اگر مسافر کیلئے موزوں پر مسح کرنے کی اجازت تین دن سے
 زیادہ لی جاتی تو آنحضرت ﷺ عطا فرمادیتے، بکثرت کتب حدیث میں بسند صحیح مروی
 ہیں، جنکی تفصیل کا یہ خیال اختصار یہ مقام متحمل نہیں ہے۔

بہر حال مذکورہ بالا نظائر سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی یہی
 تعلیم تھی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہی عقیدہ تھا کہ قانون اسلام، آنحضرت ﷺ کے سپرد

ہے۔ جس کو جو چاہیں حکم دیں اور جس کو جس سے چاہیں روک دیں۔ اسی طرح ایسی حدیثیں جن میں آیا ہے کہ **أَمْرٌ بِاللَّهِ بِسْمِ اللَّهِ يَا قُضِيَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ** یا نہی **رَسُولُ اللَّهِ ﷺ** اس قدر ہیں جنکا شمار نہایت دشوار ہے اور جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ارشاد نبوی کا ہر امر و نہی قانون اسلام ہے۔ اسی لئے آنحضرت ﷺ کے اسمائے طیبہ سے شارع **الشرع** بھی ہے۔ اور شارع کے معنی ہی شریعت ساز کے ہیں۔

تو اب سوال دوم کا جواب یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کو شریعت پر اختیار ہے۔ اس اختیار کا بیان قرآن شریف میں بھی ہے، حدیث شریف میں بھی ہے، تصریحات ائمہ میں بھی ہے اور یہی صحابہ کرام کا عقیدہ بھی تھا۔ آنحضرت ﷺ کی اس فضیلت سے انکار کرنا ملحوظوں اور وہابیوں کی بدعت ضلالت ہے۔ اس پر مستفتی کا یہ شہ کرنا کہ شیعہ، ائمہ اہل بیت کو بھی یہی اختیار دیتے ہیں لہذا ہم ان کی ضد میں نبی ﷺ کو بھی یہ خدا داد اختیار نہ دیں گے، نہایت شرمناک جرم اور افسوسناک جہالت ہے۔ مستفتی کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ بطلان ائمہ ہب شیعہ کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ ائمہ اہل بیت کو ایسے اختیارات دیتے ہیں جو اللہ اور رسول کیلئے خاص ہیں۔ اگر مستفتی کی یہی ضد قائم رہی تو خطرہ ہے کہ آج تو شارع **الشرع** کو شارع ہونے سے انکار کر دیا، کل کہیں یہ نہ کہہ دے کہ چونکہ شیعہ، ائمہ اہل بیت کو اختیار تشریعی دیتے ہیں۔۔۔ لہذا۔۔۔ میں اللہ تعالیٰ کو بھی یہ اختیار نہیں دیتا، تاکہ شیعوں سے ضد پوری ہو جائے۔

لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ 'پرائے شگون پر اپنی ناک کٹوانی' اسی کو کہتے ہیں۔ اور شیعہ، کو مستفتی نے حضرات شیعہ لکھ کر خود اپنی جماعت کو دکھ پہنچایا، اس کا ذمہ دار خود مستفتی ہے۔ اسی طرح اہل سنت و جماعت کو اہل سنت والجماعت لکھ کر دودھ دہا لیں اور آخر استفتاء میں صرف انگریزی تاریخ بلا وجہ لکھ کر پیروی سنت نصاریٰ کا ذمہ دار خود مستفتی ہی ہے۔

اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا مِنَ الْجَهْلِ وَالْجُهَالِ

ضروری ہدایات

اللہ تعالیٰ کو تو تمام شریعت پر ہر قسم کا اختیار بالذات ہے، لیکن نبی کریم ﷺ کو جو کچھ اختیار ہے وہ اللہ کی عطا سے ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جس طرح مختار ہے کہ خود اپنا حکم جب چاہے منسوخ فرمادے، اسی طرح وہ مختار ہے کہ اپنے نبی کا حکم برقرار رکھے یا مسترد فرمادے۔۔۔ یعنی۔۔۔ حکم نبوی کا واجب التعمیل ہونا حق امت میں ہے کہ اگر حکم نبوی کو اللہ تعالیٰ نے مسترد نہ فرمایا تو امت کیلئے واجب التعمیل ہے۔ لہذا یہ **يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُخَذِّرُ**۔۔۔ الخ۔۔۔ وغیرہا سے مسئلہ اختیار نبوی پر کوئی خلاف اثر نہیں پڑتا۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ مستفتی نے نماز معاف فرمانے پر غصہ میں صرف نسخ کا بے محل اور لغو مہمل شبہ کیا، لیکن جس جماعت سے مستفتی کا باب عقائد میں تعلق ہے، اسکے امام و پیشوا یعنی مولوی عبدالشکور صاحب لکھنوی، سابق ایڈیٹر 'انجم' نے جب اس حدیث کو سنا تو یکمال مدیریت آنحضرت ﷺ کو بے لگنت زبان سے لفظ 'عبدالباغی' یعنی 'بندہ سرکش' سے تعبیر کیا اور اس لفظ کو لکھ کر اپنے دستخط کے ساتھ مناظرہ کچھو چھو شریف میں میرے حوالہ کر دیا۔ جو رواد مناظرہ کچھو چھو شریف میں مدت ہوئی چھپ چکا ہے اور جسکی اصل محفوظ ہے۔

حال ایمان کا معلوم ہے بس جانے دو

اسی قسم کے دوسرے کفریات^۱ اور بارگاہ نبوی میں گستاخیاں ہیں، جنکی بنا پر عرب و عجم کے علمائے اسلام نے بالاتفاق فرمایا کہ ان لوگوں کو اسلام سے کوئی واسطہ

نہیں۔ انکے پاس بیٹھنا، ان کے ساتھ کھانا پینا، ان کی عیادت کرنا، ان کے پیچھے نماز پڑھنا، اور انکے جنازہ پر نماز پڑھنا، سخت حرام^{۲۲} اور گناہ ہے۔ مولیٰ تعالیٰ مسلمانوں کی ہدایت فرمائے کہ وہ دشمنانِ عظمتِ رسول کو اپنے دشمنوں سے زیادہ بدتر جانیں۔
وَتَسَامُ النَّفْصِیْلُ فِی الْکُتُبِ الْمُبَارَکَةِ الْأَمْنُ وَالْعَلٰی وَخَسَامُ الْخَرَمِیْنِ وَالصَّوَارِمُ الْهِنْدِیَّةُ هَذَا مَا عِنْدِی وَالْعِلْمُ عِنْدَ اللَّهِ تَعَالٰی وَاللَّهُ رَسُوْلُهُ اَعْلَمُ وَعِلْمُهُ جَلٌّ مَسْجِدُهُ اَتَمُّ وَاَحْكَمُ۔۔۔ چونکہ اس تحریر نے باوجود اختصار، رسالہ کی صورت اختیار کی۔ لہذا اس کا نام التحقیق الباری فی حقوق الشارح رکھا۔۔۔
وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ اَوَّلًا وَاٰخِرًا

کتبہ عیدہ المذنب

ابولحاح سید محمد الاشرقی البیلانی غفرلہ

۱۶ صفر المظفر ۱۴۱۵ یم دوشنبہ مبارکہ ۱۳۵۵ھ

کچھوچھو شریف۔ ضلع فیض آباد

شرح و حواشی

حَامِدًا وَ مُصَلِّيًا وَ مُسْلِمًا

﴿۱﴾۔۔۔ علامہ ابن جوزی 'مسند امام احمد' میں 'موضوع حدیث' کا ہونا بھی بیان کرتے ہیں تو پھر اس کی کسی حدیث کا کیا اعتبار رہ گیا؟۔۔۔ مذکورہ بالا اس ذہنی خلش کو دور کرنے کیلئے اتنا ہی کہنا کافی ہے، کہ علامہ موصوف نے تو 'بخاری شریف' کیلئے بھی کہا ہے کہ اس میں 'موضوع حدیث' موجود ہے۔ تو پھر 'بخاری' بھی ناقابل اعتبار ہوگئی۔ یوں ہی 'ضعیف حدیثیں'، 'بخاری شریف'، 'مسلم شریف'، بلکہ تمام 'کتب صحاح' میں ہیں، تو کیا سب کو ناقابل اعتبار قرار دے دیا جائے؟۔۔۔ لہذا ابراہیل فہم کو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ کسی کتاب میں 'ضعیف' یا 'موضوع' حدیث کا ہونا اس کی دوسری 'صحیح' روایتوں کیلئے نقصان دہ نہیں۔۔۔ ثانیاً: علامہ موصوف کا کسی حدیث کو 'موضوع' کہہ دینا کوئی حجت نہیں، کہ 'موضوع' قرار دینے میں علامہ موصوف حد سے متجاوز ہو گئے ہیں۔۔۔ ثالثاً: علامہ موصوف نے خاص کر اس حدیث شریف کو، جسے حضرت قبلہ گاہی علیہ الرحمۃ والرضوان نے 'مسند شریف' سے نقل فرمایا ہے، 'موضوع' یا 'ضعیف' نہیں کہا ہے۔ بلکہ صرف یہی کہا ہے کہ 'مسند امام احمد' میں 'موضوع' حدیث بھی ہے۔ یہ قول اس بات کو مستلزم نہیں کہ یہ حدیث مذکور 'موضوع' یا 'ضعیف' ہو۔۔۔ الحاصل۔۔۔ علامہ موصوف کا قول اس حدیث کی صحت کیلئے مضرت نہیں۔

﴿۲﴾۔۔۔ حضرت امام احمد ابن حنبل ان مجتہدین علی الاطلاق سے ہیں جنکی جلالت شان کسی مدح و ثنا سے کہیں بالاتر ہے۔

﴿۳﴾۔۔۔ یعنی اس حدیث شریف کی سند ایسی ہے جسکے تمام راوی وہ ہیں جن

سے امام مسلم اپنی 'صحیح' میں روایت کرتے ہیں اور سب کے سب شرط مسلم پر ثقہ ہیں۔
 ﴿۴﴾ --- حضرت محمد ابن جعفر کے متعلق علامہ ابن حجر نے اپنی کتاب،
 'تقریب التہذیب' (ص ۳۱۶) میں لکھا ہے کہ ان سے 'صحاح ستہ' کے علاوہ دوسری
 کتب حدیث میں روایتیں ہیں وہ 'ثقلہ صحیح الکتاب' ہیں۔ ان میں ایسی کوئی بات نہیں
 جو ثقہ ہونے کے منافی ہو۔ وہ تبع تابعین کے اس طبقہ سے ہیں جس میں امام شافعی
 وغیرہ ہیں۔ --- 'خلاصہ تہذیب الکمال' (ص ۲۸۲) میں ہے کہ محمد بن جعفر امام شعبہ کی
 خدمت میں بیٹن برس حاضر رہے۔ وہ عون و حسین، معلم و ابن جریج و ابن عروہ سے،
 اور ان سے امام احمد و ابن مدینی و ابن معین و ابن راہویہ و قتیبہ اور بکثرت ائمہ راوی
 ہیں۔ ابن معین نے ان کا لقب 'صح الناس کتاباً' دیا ہے۔ ابو داؤد کے نزدیک ۱۹۳ھ
 سال وفات ہے۔

﴿۵﴾ --- امام شعبہ کے متعلق 'تقریب' (ص ۱۶۹) میں ہے کہ ان سے بھی
 صحاح ستہ کے علاوہ دوسری کتب احادیث میں روایتیں ہیں۔ یہ ثقہ ہیں، حافظ ہیں،
 متقن ہے۔ یعنی صحابہ کرام کے بعد 'مرتبہ ثانیہ' والے ہیں اور 'امیر المؤمنین فی الحدیث'
 اور عابد ہیں۔

﴿۶﴾ --- حضرت قتادہ کے متعلق اسی 'تقریب' (ص ۳۰۵) میں ہے کہ ان
 سے 'صحاح ستہ' کے علاوہ دوسری کتب احادیث میں بھی روایتیں ہیں۔ یہ ثقہ ثبت
 ہیں۔ ان کا مرتبہ صحابہ کرام کے مرتبہ کے بعد ہے، اور یہ 'طبقہ رابعہ' کے، جس میں امام
 زہری جیسے لوگ ہیں، سردار ہیں۔

﴿۷﴾ --- نصر ابن عاصم، ان کے متعلق علامہ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ان
 سے امام بخاری نے اپنی بعض تصنیفات میں اور امام مسلم نے اپنی 'صحیح' میں اور امام
 نسائی نے اپنے 'سنن' میں اور ابن ماجہ نے اپنی 'سنن' میں حدیثیں روایت کی ہیں۔ یہ

ثقة ہیں اور اس طبقہ سے ہیں، جن میں خواجہ حسن بصری اور امام ابن سیرین ہیں۔
(تقریب: ص ۳۷۳)

فائدہ۔۔۔۔۔ حدیث زیر بحث کی سند، اگر راویوں کے نام کی جگہ ان کے اوصاف سے بیان کی جائے، تو یہ ہوئی، 'فَقَالَ الْإِمَامُ الْمُجْتَهِدُ حَدَّثَنَا ثِقَةً ثَنَا إِمَامٌ ثِقَةٌ حَافِظٌ مُتَّقٍ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ فِي الْحَدِيثِ عَابِدٌ عَنْ ثِقَةٍ ثَبَتَ رَأْسُ الطَّبَقَةِ الرَّابِعَةِ عَنْ ثِقَةٍ تَابِعِي عَنْ صَحَابِيٍّ'، ^{وہو ان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین} یعنی۔۔۔ ایک امام مجتہد سے ایک ثقہ نے حدیث بیان کی، اور ان سے ایک ثقہ، حافظ متقن، فن حدیث کے امیر المؤمنین متقی نے، وہ روایت کرتے ہیں ایک ثقہ ثابت، سر دار طبقہ رابعہ سے، اور وہ راوی ہیں ایک ثقہ تابعی سے، وہ ایک صحابی سے۔۔۔ الحاصل۔۔۔ یہ ایک ایسی نفیس اور ثقہ سند ہے جو اپنے اندر گنجائش کلام نہیں رکھتی ہے۔

﴿ ۸ ﴾۔۔۔ امام جلیل، حافظ الحدیث، علامہ جلال الدین سیوطی کی جلالت شان، محتاج تعارف نہیں۔ یہ امت مسلمہ کی ایک اہم اور گرانقدر شخصیت تھی، جو اپنے دور میں اور اپنے بعد آنے والے ہر دور میں، مرجع اہل تحقیق و ارباب علم رہی۔ ممکن ہے کہ کوئی از راہ بغض و عناد، یہ کہے کہ شاہ عبدالعزیز صاحب نے اپنی بعض تصنیفات میں تحریر کیا ہے، کہ امام جلال الدین کی تصانیف محتاج غور و فکر ہیں۔ لہذا نبی کریم کے فضائل مخصوصہ کو ثابت کرنے کیلئے 'مسند شریف' کی جو حدیث زیر بحث اپنی کتاب 'اموذج اللیب' میں نقل کی ہے وہ خود محل نظر ہوگئی۔ اسکے جواب میں اولاً میں یہ عرض کروں گا، کہ ایک ہے 'باب عقیدہ و عمل' اور دوسرا 'باب فضائل'۔ کسی عقیدہ و عمل فقہی کے ثبوت میں نہایت غور و خوض اور تفقہ تام کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اصطلاح میں 'عقیدہ ضروری' ثابت کرنے کیلئے دلیل قطعی الثبوت و قطعی الدلالت چاہیے۔ اور کسی عمل فقہی کے ثبوت کیلئے حدیث صحیح کی ضرورت ہے۔ اور اس بارے میں 'بخاری

شریف سے لیکر ہر چھوٹی بڑی کتاب کا ایک ہی نمبر ہے۔۔۔ مثلاً: یہ عقیدہ، کہ ایمان زیادتی و نقصان کو قبول کرتا ہے، یا یہ عقیدہ، کہ سیدہ خاتونِ جنت رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضرت صدیق اکبر ؓ سے بیزار تھیں، قبول نہ کیا جائے گا۔ گویا عطاءِ ثبوت بخاری شریف ہی کی حدیثوں سے کیوں نہ دیا جائے!

اسی طرح اس عمل کا حکم دینا کہ، وتر ایک ہی رکعت ہے، یا اس عمل کا حکم کہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنی واجب ہے، تسلیم نہ کیا جائیگا۔ گو ثبوت میں بخاری شریف کی حدیثیں کیوں نہ ہوں! اسلئے کہ عقیدہ و عمل کے ثبوت کیلئے امت اسلامیہ ان شخصیتوں کی محتاج ہے جنکی امامت تفقہ اور مہارت اجتہاد پر سب کا اجماع ہو۔ لیکن جہاں عقیدہ و عمل کے ثبوت میں اتنی تنگی و شدت ہے، وہاں باب فضائل میں اتنی وسعت ہے کہ کسی 'مسلم الثبوت' یا کسی 'مقبول عمل' کی فضیلت ثابت کرنے کیلئے بالاتفاق ائمہ حدیث، حدیث ضعیف، بھی حجت ہے۔ اور حدیث غریب تو بدرجہ اولیٰ حجت ہے، کہ ہر 'غرائب' صحت کے منافی نہیں ہوا کرتی۔

شاہ عبدالعزیز صاحب نے عقیدہ و عمل کے ثبوت میں تصانیف امام جلال الدین کو محتاج غور و فکر بتایا ہے، نہ کہ بحث فضائل میں۔

﴿عائنا﴾۔۔۔ قرآن کریم کے سوا کوئی ادنیٰ یا اعلیٰ ایسی کتاب نہیں، جس میں کوئی نہ کوئی خامی نہ ہو۔ اور کوئی غیر نبی ایسا نہیں جس میں مزائد اقدام کا امکان نہ ہو۔ اگر اسی امکان کی بنیاد پر سب کی تصنیفوں کو ناقابل اعتماد کہہ کر الگ کر دیا جائے، تو پھر قرآن کریم کے سوا دوسری کتاب قابل حجت کیسے رہ سکتی گی۔

﴿عائنا﴾۔۔۔ شاہ عبدالعزیز صاحب نے یہ نہیں فرمایا ہے، 'امموزج الملیب' کی حدیث زیر بحث، محتاج غور و فکر ہے اور اسکی صحت میں گنجائش کلام ہے۔ لہذا شاہ صاحب کا صرف اتنا کہہ دینا کہ تصانیف امام جلال الدین محتاج غور و فکر ہیں، اس

حدیث کی صحت کیلئے نقصان دہ نہیں۔

﴿رابعاً﴾۔۔۔ حدیث زیر بحث صرف ’انموذج اللیب‘ ہی میں منقول نہیں بلکہ ’مسند امام احمد‘ میں بھی ہے۔ اور یہ ’مسند شریف‘، تصانیف امام جلال الدین سے تو ہے نہیں۔ ایسی صورت میں شاہ صاحب کا مذکورہ بالا خیال، اس حدیث کیلئے کیسے مضر ہو سکتا ہے۔

﴿خامساً﴾۔۔۔ شاہ صاحب نے جملہ تصانیف امام موصوف کو جو محتاج غورو فکر کہا ہے یہ ’جرح مبہم‘ ہے اسلئے کہ انہوں نے یہ تصریح نہیں کی ہے کہ کس تصنیف میں کون سی بات اور کس وجہ سے محل نظر ہے۔ ’جرح مبہم‘ اگر راویان حدیث میں سے کسی سے متعلق ہو۔۔۔ مثلاً: کوئی ناقد حدیث، خصوصاً ابن جوزی وغیرہ یہ کہہ دیں کہ یہ راوی ضعیف ہے، اور وجہ ضعف کی تصریح نہ کریں۔ یعنی یہ نہ بتائیں کہ کیوں ضعیف ہے اور اس راوی میں کیا ضعف ہے، تو ایسی جرح کا علمائے اصول کے نزدیک کوئی مقام نہیں۔ کیونکہ وجہ ضعف میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ ایک چیز کو بعض عیب سمجھتے ہیں اور بعض نہیں۔۔۔ مثلاً: تدلیس، ارسال، گھوڑے دوڑانا، مذاق، نوعمری میں فقہ میں مشغولیت، کو بعض لوگوں نے راوی کا عیب جانا ہے۔ مگر حنفیوں کے نزدیک ان میں سے کچھ بھی عیب نہیں۔ (ملاحظہ ہو نور الانوار: ص ۱۹۲)۔ اسی طرح متین حدیث یا کسی کی تصنیف سے متعلق ’جرح مبہم‘ کا کوئی اعتبار نہیں۔

﴿۹﴾۔۔۔ نسخ کی صورت یہ ہے۔۔۔ مثلاً: اللہ تعالیٰ نے ساری امت مسلمہ کو یا بعض افراد مخصوصہ کو کوئی حکم دیا، یعنی ان پر کسی عمل کو فرض فرما دیا۔ پھر رسول کریم نے ان سب سے جن جن پر وہ حکم فرض تھا، اُس حکم کو ہٹا دیا۔ اسی مثال پر ’نسخ قرآن بالقرآن‘، ’نسخ قرآن بالحدیث‘، ’نسخ حدیث بالقرآن‘ اور ’نسخ حدیث بالحدیث‘ کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔ رہ گیا کسی حکم کا ساری امت مسلمہ کیلئے فرض ہونا اور پھر رسول کریم

ﷺ کا سب کیلئے اس کی فرضیت کو باقی رکھتے ہوئے، صرف ایک فرد یا بعض افراد مخصوصہ کو اپنے خصوصی اختیارات تشریفی کی بنا پر اُس حکم سے مستثنیٰ قرار دیدینا، اصل حکم کا نسخ نہیں ہے۔ اور اگر کوئی اس کو نسخ ہی کہنے پر مضر ہے، تو اس نسخ کی نوعیت وہی ہے جس کا ذکر متن کتاب میں ہے۔

﴿۱۰﴾۔۔۔ اگر کوئی یہ کہے کہ حدیث زیر بحث میں جن صحابی کا واقعہ مذکور ہے، ان کا نام نہیں بتایا گیا ہے۔ لہذا وہ مجہول العدالت ہوئے۔ ایسی صورت میں اس حدیث کا کیا اعتبار رہ گیا؟۔۔۔ اسکے جواب میں صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ مذہب اہل سنت و جماعت میں تمام صحابہ عدول و ثقہ اور جت ہیں۔ اسی لئے ائمہ فن اسمائے رجال صحابی کیلئے محض صحابی لکھ دینا کافی سمجھتے ہیں۔ کسی صحابی کے اسم شریف کا عدم ذکر انکی عدالت کیلئے مضر نہیں۔ بطور طعن و تبراکسی صحابی کو مجہول العدالت و کذاب کہنا روافض و خوارج کا مذہب ہے۔

﴿۱۲﴾۔۔۔ اسلئے کہ جب باب فضائل میں حدیث ضعیف جت ہے، جیسا کہ حاشیہ نمبر ۸، میں اشارہ گزر چکا ہے، تو پھر حدیث صحیح، تو بدرجہ اولیٰ جت ہے، اس میں کسی کیلئے گنجائش کلام نہیں۔ حدیث زیر بحث چونکہ حدیث صحیح ہے، لہذا کسی فتنہ منکر کا کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔

فائدہ نمبر ۱۔۔۔ صحیح وہ حدیث ہے جس میں چار خوبیاں ہوں۔

﴿۱﴾۔۔۔ اسکی اسناد متصل ہوں کہ حضور ﷺ سے لیکر مؤلف کتاب تک کوئی راوی کسی جگہ چھوٹا نہ ہو۔

﴿۲﴾۔۔۔ اسکے سارے راوی اوّل درجہ کے متقی و پرہیزگار ہوں۔ کوئی فاسق یا مستور الحال نہ ہو۔

﴿۳﴾۔۔۔ تمام راوی نہایت قوی الحافظ ہوں کہ کسی کا حافظہ بیماری یا

بڑھاپے کی وجہ سے کمزور نہ ہو۔

﴿۲﴾۔۔۔ وہ حدیث 'شاذ' یعنی احادیث مشہورہ کے خلاف نہ ہو۔

﴿حسن﴾۔۔۔ وہ حدیث ہے جسکے کسی راوی میں یہ صفات اعلیٰ درجہ کے نہ ہوں یعنی کسی کا تقویٰ یا قوت حافظہ اعلیٰ درجہ کا نہ ہو۔

﴿ضعیف﴾۔۔۔ وہ حدیث جس کا کوئی راوی متقی یا قوی الحافظ نہ ہو، یعنی جو صفات 'حدیث صحیح' میں معتبر نہیں، ان میں سے کوئی ایک صفت نہ ہو۔

پہلی دو قسمیں یعنی 'صحیح اور حسن' احکام اور فضائل سب میں معتبر ہیں۔ لیکن 'حدیث ضعیف' صرف فضائل میں معتبر ہے، احکام میں معتبر نہیں۔ یعنی اس سے حلال و حرام احکام ثابت نہ ہونگے۔ ہاں اعمال یا کسی شخص کی عظمت و رفعت ثابت ہو سکتی ہے۔ معلوم ہوا کہ 'ضعیف حدیث' جھوٹی یا غلط یا گڑھی ہوئی حدیث کو نہیں کہتے، بلکہ محدثین نے محض احتیاط کی بنا پر اس حدیث کا درجہ پہلے دو سے کچھ کم رکھا ہے۔ اگر 'حدیث ضعیف' کسی وجہ سے 'حسن' بن جائے تو وہ بھی مطلقاً معتبر ہے۔ اس سے احکام و فضائل سب کچھ ثابت ہو سکتے ہیں۔

مندرجہ ذیل چیزوں سے 'حدیث ضعیف' 'حسن' بن جاتی ہے:

﴿۱﴾۔۔۔ دو یا زیادہ سندوں سے روایت ہو جانا اگرچہ وہ سب اسناد ضعیف ہوں۔

﴿۲﴾۔۔۔ علمائے کالمین کے دائرہ عمل میں آ جانا۔

﴿۳﴾۔۔۔ علمائے کرام کے تجربہ اور اولیاء کے کشف سے معلوم ہو جانا۔ کسی عالم، فقیہ، محدث، کا اُس کو بغیر کسی اعتراض کے قبول کر لینا۔

اسناد، یعنی سلسلہ راویان حدیث کے ضعف سے 'متن حدیث' کا ضعف لازم نہیں۔ لہذا یہ ہو سکتا ہے کہ ایک حدیث ایک اسناد میں ضعیف ہو، دوسری اسناد میں حسن ہو اور تیسری میں صحیح۔ کسی حدیث کے صحیح نہ ہونے سے اس کا ضعیف ہونا لازم

نہیں۔ ممکن ہے کہ وہ حدیث حسن ہو۔۔۔ اگر جرح و تعدیل میں تعارض ہو تو تعدیل کو قبول کیا جائے گا۔ یعنی ایک راوی کو کسی محدث نے ضعیف کہا، کسی نے اسے قوی فرمایا، بعض تواریخ سے اس کا فسق ثابت ہوا، بعض نے فرمایا وہ متقی صالح تھا، تو اسے متقی مانا جائے گا اور اسکی روایت ضعیف نہ ہوگی، کیونکہ مؤمن میں تقویٰ اصل ہے۔

صحیح حدیث کا دار و مدار بخاری یا صحاح ستہ پر نہیں۔ صحاح ستہ کو صحیح کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان میں صحیح حدیثیں زیادہ ہیں۔ یہ نہیں کہ انکے سوا دوسری کتب کی ساری حدیثیں ضعیف ہیں۔ (ملاحظہ ہو جلاء الحق: حصہ دوم)

فائدہ نمبر ۲۔۔۔ ممکن ہے کہ کوئی ابن تیمیہ کے حوالہ سے یہ کہے کہ اگر کسی حدیث میں ایسا مضمون ہو جو متواترات و مشہورات کے خلاف ہو، تو وہ حدیث ’موضوع‘ ہے۔ اور جب یہ طے شدہ بات ہے کہ تمام عاقل، بالغ مسلمانوں پر پانچ وقت کی نماز کا فرض ہونا متواترات سے ہے۔ لہذا کسی ایک شخص کیلئے دو ہی نماز کی پابندی کا نبی کریم ﷺ کا قبول فرمالینا، اس متواتر کے خلاف ہے۔ اس سے نماز پنجگانہ کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔

اسکے جواب میں عرض کروں گا کہ۔۔۔ اولاً۔۔۔ یہ قول قطعی غلط ہے کہ اگر کسی حدیث کا مضمون متواترات کے خلاف ہو تو وہ ’موضوع‘ ہے۔ اسلئے کہ بہت سی حدیثیں منسوخ ہیں اور بہت سی ناسخ۔ حدیث ناسخ کے سبب حدیث منسوخ، عمل نہیں کیا جاتا۔ بایں ہمہ۔۔۔ ناسخ کا تو اترا یا اسکی شہرت، اس حدیث کی صحت کیلئے مضرت نہیں جبکہ حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ لہذا اس حدیث کو موضوع نہیں قرار دیا جاسکتا۔ وہ بہر حال حدیث رسول ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس سے جو حکم پہلے معمول یہ تھا اب منسوخ ہو گیا۔

قرآن پاک میں بھی کچھ احکام ناسخ ہیں اور کچھ منسوخ، اور ناسخ اپنے منسوخ کے خلاف ہی ہوا کرتا ہے، تو کیا ان ساری آیات منسوخہ کو قرآن کہنے سے انکار کر دیا

جایگا اور موضوع کہہ دیا جائیگا؟۔۔۔ قرآنی آیات ناسخہ اور منسوخہ دونوں کا ثبوت تو اتر سے ہے تو گویا ایک متواتر دوسرے متواتر کے خلاف ہوا۔ اب اس میں کس کو موضوع کہیں گے اور کس کے کلام الہی اور احکام خداوندی ہونے سے انکار کریں گے؟ اگر اس اختلافات کے باوجود کسی کے قرآن ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا، تو پھر اگر کوئی حدیث صحیح متواترات و مشہورات کے خلاف ہو، تو اُس کو موضوع کیسے قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس گفتگو سے یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ 'مسند شریف' کی حدیث زیر بحث متواترات یا مشہورات کے خلاف ہے، بلکہ ان چند سطروں سے مجھے صرف اتنا بتانا ہے کہ ابن تیمیہ کا بنایا ہوا مذکورہ بالا قاعدہ بالکل غلط ہے۔

قاعدہ تو صرف اتنا بیان کرنا چاہئے تھا کہ باب عقائد و فضائل و اخبار و بیان میں چونکہ تنسیخ کا کوئی سوال نہیں، لہذا اگر کسی حدیث میں ان ابواب سے متعلق کوئی مضمون ہو اور وہ مضمون احادیث مشہورہ متواترہ، یا آیات قرآنیہ کے خلاف و معارض ہو تو وہ حدیث موضوع ہے۔

تعارض و تخالف کی صورت یہ ہے۔۔۔ مثلاً: ایک حدیث سے پتہ چلے کہ حضور نے اس عقیدہ کی تعلیم دی ہے اور اس کو اسلام کا عقیدہ بتایا ہے اور دوسری مشہورات و متواترات یہ کہیں، کہ رسول کریم نے اس عقیدہ کی تعلیم نہیں دی ہے اور اس کو اسلامی عقیدہ نہیں فرمایا ہے، بلکہ اس عقیدہ کی نفی فرمائی ہے۔۔۔ یا۔۔۔ ایک حدیث سے یہ معلوم ہو کہ۔۔۔ مثلاً: حضور کو فضیلت حاصل ہے اور دوسری مشہورات و متواترات یہ فرما رہی ہوں کہ آپ کو یہ فضیلت حاصل نہیں۔۔۔ یا۔۔۔ ایک حدیث یہ کہہ رہی ہو کہ حضور نے یہ خبر دی ہے، اس بات کا حکم دیا ہے، اور اس سے روکا ہے اور دوسری مشہورات و متواترات سے پتہ چلے کہ حضور نے نہ تو یہ خبر دی ہے، نہ اس کا حکم دیا ہے، اور نہ اس سے روکا ہے۔۔۔ یا۔۔۔ ایک حدیث یہ کہے کہ حضور نے فلاں آیت وغیرہ کا یہ مطلب

بیان فرمایا ہے۔ اور دوسری مشہورات و متواترات یہ بتائیں کہ حضور نے یہ مطلب نہیں بیان فرمایا ہے۔

۔۔۔ الحاصل۔۔۔ یہ ہیں ان تخالف و تعارض کی مثالیں جو مشہورات و متواترات کے خلاف کو موضوع قرار دیتی ہیں۔ رہ گیا نسخ و منسوخ کا تخالف و تعارض، تو یہ منسوخ کو موضوع نہیں قرار دیتا۔ لہذا اس قاعدہ کو ایسا عام کر دینا کہ اس میں احکامات بھی شامل ہو جائیں جو بذریعہ وحی (خواہ وحی متلو ہو یا غیر متلو) تنفیخ کی گنجائش رکھتے تھے، ایک کھلی ہوئی غلطی ہے۔۔۔ ہائیا: کسی آیت یا کسی حدیث متواتر یا کسی حدیث مشہور میں یہ مضمون نہیں آیا ہے کہ کسی نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا ہو کہ صرف دو نمازوں پر اسلام قبول کروں گا، تو حضور نے فرمایا ہو کہ یہ میرے اختیار سے باہر ہے۔

مضمون بالا کسی متواتر حدیث، یا مشہور حدیث، یا خبر واحد، میں تو جانے دیجئے، ضعیف حدیث میں بھی نہ ملے گا۔ تو پھر حدیث زیر بحث کو متواترات یا مشہورات کے خلاف کیسے کہا جاسکتا ہے؟ حدیثوں میں آیا ہے کہ قبیلہ بنی لثیف نے نماز سے بالکل اور بحیرہ ابن عامر ؓ نے صرف نماز عشاء سے معافی چاہی تھی، تو اس پر حضور نے یہ نہ فرمایا کہ، اس کا مجھ کو حق ہی نہیں۔ میرے متعلق تمہارا یہ اعتقاد شرک ہے۔ بلکہ فرمایا کہ بالکل نماز نہ ہونا تو بہت بری بات ہے اور نماز عشاء کا مشکل ہونا، اگر دو دھدھ دھنے کے خیال سے ہے، تو مطمئن رہو، تم دونوں کام انجام دے لو گے۔ ان دونوں حدیثوں سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ صحابہ کرام کا یہ عقیدہ تھا، کہ رسول کریم پورے تشریفی اختیارات رکھتے ہیں۔ جو چاہیں، جس کیلئے فرمادیں۔ ورنہ ان کا ایک نماز، یا تمام نماز سے معافی چاہنا، کیا کراۃ نہ ٹھہرے گا؟ بلکہ سوء اعتقاد کی طرف بھی مشیر ہوگا۔

حدیث زیر بحث میں ایک طالب ایمان اس شرط پر ایمان لانا چاہتا ہے کہ وہی وقت کی نماز پڑھے گا۔ ایسی صورت میں رسول کریم ﷺ اپنے خصوصی اختیارات

سے کام لے کر اسکی شرط کو منظور نہ فرمائیں، تو وہ ایمان سے محروم رہ جاتا ہے۔ لیکن ان دو حدیثوں میں جسکی طرف اشارہ کر چکا ہوں، چونکہ مومنین کی ایک جماعت طالب رخصت ہے، لہذا رسول کریم ﷺ نے بجائے رخصت کے، اپنے موعظہ حسنہ سے انکے قلوب کو مطمئن کر دیا۔ اسلئے حدیث زیر بحث کو ان دونوں حدیثوں پر یا ان دونوں حدیثوں کو حدیث زیر بحث پر نہ تو قیاس کیا جاسکتا ہے اور نہ ایک دوسرے کو ایک دوسرے کا خلاف و معارض کہا جاسکتا ہے۔ ﴿ثالثاً﴾۔۔۔ یہ خیال بھی غلط ہے کہ عہد پاک نبوی میں کسی ایک شخص پر دو ہی نماز کی پابندی، نبی کریم ﷺ کا قبول فرمالینا، نماز چچگانہ کی اہمیت کو کم کرنا ہے۔ اسلئے کہ اس سے نماز چچگانہ کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔

دیکھ لیجئے کہ رمضان کے روزے فرض ہیں اور جو شخص عمداً ایک روزہ توڑ دے تو اُس کا کفارہ یہ ہے کہ ایک غلام آزاد کرے یا دو مہینے کے مسلسل روزے رکھے، یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ یہ کفارہ تمام امت میں مشہورات بلکہ متواترات سے ہے۔ لیکن ابو داؤد میں حضرت ابو ہریرہ ؓ کی حدیث موجود ہے کہ ایک صحابی نے رمضان المبارک کا ایک روزہ دانستہ توڑ ڈالا اور جب سرکارِ دو عالم ﷺ سے عرض کیا تو حضور نے کفارہ کی تعلیم دی۔ جب صحابی نے عرض کیا مجھ سے تینوں کاموں میں سے ایک بھی نہیں ہو سکتا، تو حضور نے فرمایا بیٹھو۔ اتنے میں، بارگاہِ نبوی میں کھجوریں آئیں تو ارشاد فرمایا، اس کو لے لو اور صدقہ دے دو۔ صحابی نے عرض کیا، مجھ سے زیادہ کوئی محتاج ہی نہیں ہے۔ اس پر رحمتِ مجسم ﷺ مسکرا دیئے، یہاں تک کہ دندان مبارک نمایاں ہو گئے اور ارشاد فرمایا، تم ہی کھاؤ۔

یہی حدیث ابن جریر نے امام زہری کے واسطے سے بھی روایت کی ہے اور اسی حدیث کو اصول فقہ حنفی کی مشہور کتاب 'نور الانوار' میں 'مقام استنواؤ' میں ذکر فرمایا ہے۔ لیکن اُن ایک صحابی کیلئے مراعات فرمانے کو نہ کسی نے یہ سمجھا کہ روزہ رمضان کی

فرضیت کی اہمیت کو کم کرنا ہے، نہ یہی سمجھا کہ حکم، کفارہ کے خلاف ہے، لہذا موضوع ہے۔۔۔ الحاصل۔۔۔ حدیث زیر بحث کا مضمون خلاف متواترات اُس وقت ہوتا جبکہ اس میں نماز پنجگانہ میں سے کسی ایک نماز کو بھی تمام امت اسلامیہ سے معاف کر دینا مذکور ہوتا۔

فائدہ نمبر ۳۔۔۔ اس حدیث زیر بحث کے مضمون کے متعلق آخری بات ابن تیمیہ کے حوالے سے یہ بھی کہی جاسکتی ہے کہ جس حدیث کو ایک دو ہی روایت کریں، اور چاہئے تھا کہ بکثرت راوی ہوتے، تو وہ موضوع ہے۔ اسکے جواب میں صرف اتنا عرض کروینا کافی ہے کہ دو وقت کی نماز والی حدیث ہو، یا کفارہ صوم والی، دونوں واقعے کے کسی مجمع عام میں ہونے کا کس کو دعویٰ ہے۔ جس کو دو وقت کی نماز کیلئے فرمایا اس کو حق حاصل ہے کہ اپنا واقعہ بیان کرے۔ کفارہ صوم والے واقعہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے، لہذا اس کو بیان فرما دیا۔ اور پھر واقعہ میں کوئی اہمیت نہیں، کیونکہ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قرآن کریم سے سمجھ لیا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار ہے، جسکو جو چاہیں، حکم دیں۔ تو پھر ایک واقعہ، جزئیہ کے روایت کرنے پر تمام جماعت کو کیا چیز ابھار سکتی تھی۔ واقعہ کی اہمیت اس کو کہتے ہیں کہ وضو میں پاؤں کا دھونا فرض ہے، لیکن نبی کریم نے موزوں پر مسح کرنے کا حکم دیا ہے۔ اگر ایسا اہم حکم دوا ایک ذریعہ سے ہم تک پہنچتا، تو حیرت ہوتی کہ جس حکم میں ساری امت کو خطاب ہو وہ صرف دوا ایک راوی کے پاس ہو۔ لیکن جو رعایت کسی ایک شخص خاص کیلئے مختص ہو، اس کو دوا ایک نہیں تو کیا دس! بیس! ہزار روایت کریں گے۔

﴿ ۱۲ ﴾۔۔۔ تفسیر جلالین میں زیر آیت کریمہ مذکور ہے:

(مَا أَتَاكُمْ (الرَّسُولُ) مِنَ الْفَعْلِ وَغَيْرِهِ

(فَعَلُوا وَمَا يَنْهَى عَنْهُ فَأْتُوا))

مال ہو یا مال کے سوا کوئی حکم ہو، جو رسول دیں اس کو لے لو
اور جس سے روکیں اُس سے باز رہو۔

--- تفسیرات احمدیہ میں ہے:

(مَا أَتَاكُمُ الرَّسُولُ) مَا أَتَاكُمُ مِنَ الْفَيْءِ (فُخْذَلُ)
لِأَنَّهُ حَلَالٌ لَّكُمْ أَوْ مَا أَتَاكُمُ مِنَ الْأَمْرِ فُتْمَسِكُوا بِهِ لِأَنَّهُ وَاجِبُ الطَّاعَةِ
(وَمَا تَهَمُّكُمْ عَنْهُ) أَيْ عَنْ اخِذِهِ وَإِيتَائِهِ (فَأَنْتَهُوا) عَنْهُ

رسول جو مال دیں اس کو لے لو کہ وہ تمہارے لئے حلال ہے
اور جو حکم دیں اس کو اختیار کرو کہ رسول کی اطاعت واجب ہے اور جسکے لینے
اور کرنے سے روکیں اس سے رک جاؤ

--- جواہر التفاسیر میں ہے:

’محققان بر آنند کہ حکم ایں کلمات عام است ومعنی
وہ آنکہ ہرچہ امر فرماید پیغمبر بدار آنرا و اگیرید و فرمان
برید و ہرچہ نہی کند ازاں باز ایستید کہ امر و نہی اُو بحق
است۔ ہر کہ مرتکب امر اُو گرد و نجات یابد و ہر کہ از نہی
اُو اجتناب نہ نماید در ورطہ ہلاکت افتد۔‘

--- تفسیر مدارک میں ہے:

وَالْأَجْوَدُ أَنْ يَكُونَ عَامًّا فِي كُلِّ مَا آتَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ
وَنَهَى عَنْهُ وَأَمَرَ الْفَيْءَ دَاخِلٌ فِي عُمُومِهِ۔
ٹھیک یہی ہے کہ آیہ کریمہ ہر امر و نہی کو عام ہے،
مال بھی عموم فرمان کے اندر داخل ہے

--- تنویر المقباس من تفسیر ابن عباس میں ہے:

مَا أَمَرَ كُمْ الرَّسُولُ فَأَعْلَمُوا بِهِ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَأَنْتَهُوا

وَاتَّقُوا اللَّهَ، اخْشُوا اللَّهَ فِيمَا أَمَرَكُمْ -

رسول جس کام کا حکم دیں اس کو بجالاؤ اور جس سے روک دیں اُس سے باز رہو اور حکم نبی سے مخالفت کرنے میں اللہ سے ڈرو۔

-- تفسیر بیضاوی میں ہے:

(وَمَا أَسْأَلُكَ الرَّسُولَ) وَمَا أَعْطَاكُمْ مِنَ الْفَتَى أَوْ مِنَ الْأَمْرِ

(فَتَنًا وَلَا) لِأَنَّهُ حَلَالٌ لَّكُمْ أَوْ فُتْمِسْكُوا بِهِ لِأَنَّهُ

وَاجِبُ الطَّاعَةِ وَمَانَهَاكُمْ عَنْهُ - عَنْ أَحْمَدَ مِنْهُ

أَوْ عَنْ إِيْيَانِهِ (فَأَنْتَهُوْا) عَنْهُ (وَاتَّقُوا اللَّهَ فِي مَخَالَفَةِ رَسُولِهِ) -

رسول جو مال دیں وہ حلال ہے، یا جو حکم دیں وہ واجب تعمیل ہے

اور جسکے لینے یا کرنے سے روکیں، اُس سے باز رہو

اور رسول کی مخالفت کرنے میں اللہ سے ڈرو۔

-- تفسیر خازن میں ہے۔

وَهُوَ عَامٌّ فِي كُلِّ مَا أَمَرَ بِهِ النَّبِيُّ ﷺ أَوْ نَهَى عَنْهُ مِنْ

قَوْلٍ أَوْ عَمَلٍ مِنْ وَاجِبٍ أَوْ مُنْذَوْبٍ أَوْ مُسْتَحَبٍّ أَوْ نَهَى

عَنْ مُحَرِّمٍ فَيَدْخُلُ فِيهِ الْفَتَى وَغَيْرُهُ -

آیہ کریمہ عام ہے۔ ہر حکم نبوی کو جس کا بھی حکم دیا، جس سے بھی منع فرمایا

اپنے قول و عمل سے اتر قسم واجب یا مندوب یا مستحب کے یا حرام کے روک دینے کے

اس میں مال وغیر مال سب داخل ہیں۔

-- اسی تفسیر خازن، اسی آیہ کریمہ کی تفسیر میں یہ حدیث بھی ہے جسکی روایت ابو داؤد

ترمذی نے کی ہے:

عَنْ أَبِي رَافِعٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ لَا آجِدُكُمْ مُتَّكِئًا

عَلَىٰ أَرْنَبِكُمْ يَأْتِيهِ أَمْرٌ مِّمَّا أَمُرْتُ بِهِ أَوْ نُهَيْتُ عَنْهُ فَيَقُولُ
لَا أَذَرِي مَا وَجَدْنَا فِي كِتَابِ اللَّهِ اتَّبِعْنَاهُ۔

ابورافع ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں تم میں سے کسی کو
اس طرح نہ پاؤں کہ اپنی نشست گاہ پر تکیہ لگائے بیٹھا ہے، اُس تک
میری جانب سے کوئی حکم یا ممانعت آئے، تو کہہ دے کہ میں اس کو نہیں جانتا،
جو کچھ اللہ کی کتاب میں، میں نے پایا اس کی پیروی کی۔

--- تفسیر روح البیان میں ہے:

وَمَا أَتَاكُمُ الرَّسُولُ مِنْ الْأَمْرِ مُطْلَقًا أَوْ غَيْرِهِ أَصُولًا اِعْتِقَادِيَّةً
أَوْ فُرُوعًا عَمَلِيَّةً فَخُذُوا أَيْ فَتَمَسِّكُوا فَإِنَّهُ وَاجِبٌ عَلَيْكُمْ۔
رسول تم کو جو بھی حکم دیں مال کا، یا غیر کا، اعتقادی بات کا یا عملی کا،
اُس کو اختیار کرو کہ یہ تم پر واجب ہے۔

--- تفسیر درمنثور میں زیر آیت کریمہ متعدد حدیثیں منقول ہیں۔ ان میں سے چند
حدیثوں کا محض ترجمہ ہدیہء ناظرین کر رہا ہوں:

﴿۱﴾۔۔۔ ابن ابی شیبہ و عبد بن حمید و نسائی و ابن منذر نے حضرت عبد اللہ
ابن عباس سے روایت کی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا:
وَمَا أَتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوا وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا۔۔۔ اور یہ کہ: مَا كَانَ
لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُمْمِنَةٍ إِذَا قَضَىٰ اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ
مِنْ أَمْرِهِمْ۔ سب نے کہا ضرور فرمایا ہے۔ تو حضرت عبد اللہ بن عباس نے فرمایا
کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ رسول اللہ نے دبا، ختم، نقیر، مزفت، شراب کے برتنوں
کے استعمال سے منع فرمایا ہے۔

﴿۲﴾۔۔۔ عبد بن حمید نے حضرت سعید بن جبیر سے روایت کی ہے کہ

انھوں نے حضرت عمر و حضرت ابن عباس کو سنا، وہ گواہی دے رہے تھے کہ نبی کریم نے دبا، ختم، تھیر، مزفت، ظروف شراب نوشی کے استعمال سے منع فرمایا ہے۔ پھر خود رسول کریم نے اس آیت کریمہ کی تلاوت فرمائی:

--- وَمَا أَلَيْسَ الرَّسُولُ خَذُوًّا وَمَا أَلَيْسَ عَنْهُ قَاتِلُهُوًّا --- ﴿سورۃ النحر: ۱۱﴾

﴿۳﴾۔۔۔ یہ تیسری حدیث دُر منثور کے علاوہ خازن اور روح البیان میں بھی ہے۔ امام احمد ابن حنبل، عبد بن حمید، امام بخاری، امام مسلم، ابن منذر اور ابن مردویہ نے حضرت علقمہ سے روایت کی ہے کہ عبد اللہ ابن مسعود نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو خوبصورتی کیلئے گودانی والی، گودنے والی، چہرہ کے بال اکھاڑنے والی اور دانتوں میں کھڑکیاں بنانے والی عورتوں پر، جو اللہ کی پیدا کی ہوئی چیز کو بد لئے والی ہیں۔ اسی خبر قبیلہ بنی اسد کی ام یعقوب نامی ایک عورت کو پہنچی، وہ آئیں اور کہا کہ مجھ کو خبر لی ہے کہ آپ فلاں فلاں پر لعنت بھیج رہے ہیں۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا کہ جس پر رسول کریم نے لعنت بھیجی، جو کتاب اللہ میں ہے، اس پر میں کیوں نہ لعنت بھیجوں! ام یعقوب نے کہا کہ میں نے سارا قرآن پڑھ ڈالا اس میں تو کچھ نہیں پایا۔ ابن مسعود نے فرمایا اگر قرآن کو پڑھا ہوتا تو ضرور پا جاتیں، کیا اس آیت کو نہیں پڑھا۔

--- وَمَا أَلَيْسَ الرَّسُولُ خَذُوًّا وَمَا أَلَيْسَ عَنْهُ قَاتِلُهُوًّا --- ﴿سورۃ النحر: ۱۱﴾

۔۔۔ ام یعقوب نے کہا یہ تو ہے۔ اس پر ابن مسعود نے فرمایا کہ ان حرکتوں سے رسول کریم نے منع فرمایا ہے۔۔۔ ان جملہ تقاسیر سے یہ بات روشن ہوگئی کہ آیت زیر بحث عام عموماً میں اموال و احکام بھی داخل ہیں جس سے کسی کو مجال انکار نہیں۔۔۔ الحاصل۔۔۔ چنے مورد خاص کی بنا پر اموال کا اس میں داخل ہونا اسکے عموم سے احکام کو نہیں نکالتا۔ اس مقام پر مناسب ہے کہ قارئین شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کے

اس ارشاد کو بھی ملاحظہ کرتے چلیں:

’معنی رسول رسانندہ پیغام است (الی قولہ) نہ آنکہ ہر قول اویغام
خدا باشد‘ وآیہ۔۔۔ **وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۚ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۖ**۔۔۔
صریح خاص بقرآن است بدلیل **عَلَّمَكَ شَيْئًا نَّوَىٰ ۖ**
(تخداثنا عشریہ)

۔۔۔ الحاصل۔۔۔ شاہ صاحب کے نزدیک آیہ **وَمَا يَنْطِقُ**۔۔۔ الخ میں صرف
قرآن کریم داخل ہے، کیونکہ **عَلَّمَكَ**۔۔۔ الخ میں اسی قرآن کریم ہی کی تعلیم کا بیان
ہے۔ اس میں وہ احکام داخل نہیں جو احادیث میں ہیں۔ اگر عموم نظم کے تقاضہ کو مد
نظر رکھتے ہوئے آیت کریمہ **وَمَا يَنْطِقُ**۔۔۔ الخ کو عام معنی میں رکھا جائے تو وحی کی وحی
متلو اور وحی غیر متلو کی طرف تقسیم کر کے قرآن وحدیث میں فرق کیا جائے گا جیسا کہ
علمائے اصول نے فرق کیا ہے۔ اس صورت میں قرآن وحی متلو ہے اور حدیث وحی
غیر متلو۔ یعنی قرآن کی تلاوت نماز میں کی جاتی ہے بخلاف حدیث کے۔ درحقیقت
احکام رسول، احکام خداوندی ہیں اور آپ کے فرمان، فرمان ہائے الہی، اسی لئے
واجب العمل ہیں۔۔۔ اب کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ احادیث کے سارے احکامات
سیدنا جبرائیل لے کر آئے لہذا ان سے نبی کریم کا بحیثیت شارح کوئی تعلق نہیں۔
اسلئے کہ آیہ کریمہ **مَا كَانَ لِشَيْءٍ أَنْ يُبَدِّلَهُ اللَّهُ**۔۔۔ آیہ اسکے خلاف ہے۔ اس
میں وحی الہی کے دوسرے طریقے بھی مذکور ہیں۔

﴿ثَانِيًا﴾۔۔۔ شب معراج موافق **فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ** وہاں وحی
ہوئی، جہاں تک سیدنا جبرائیل امین کی رسائی بھی نہیں ہے۔

﴿ثالثًا﴾۔۔۔ اجزائے نبوت میں ایک جزء الہام بھی ہے۔ اگر وہ بھی بواسطہ
سیدنا جبرائیل ہے تو اب الہام کا دروازہ بند ہو جانا چاہئے، حالانکہ اولیائے کرام کو بھی

الہام ہوتا ہے۔۔۔ نیز۔۔۔ علمائے کرام بھی بطور تشکر اکثر فرماتے ہیں:

هَذَا مَا أَلْهَمَنِي رَبِّي

﴿رابعاً﴾۔۔۔ بخاری شریف کی حدیث 'صَلَّوْا عَلَى الْحَجَّاسِ' میں وحی کی

کیفیت اس حصر کے خلاف ہے۔

میں نے اس مقام پر کافی تفصیل و تحقیق سے کام لیا ہے، لہذا اس آئیہ کریمہ کے بعد کی آیات مقدسہ کی تفسیر و تشریح کی چنداں ضرورت نہیں رہ گئی ہے۔ ویسے وہ آیات کریمہ صرف اپنے الفاظ ہی کے ساتھ حضرت قبلہؐ کا ہی کے مدعا کی واضح دلیل ہیں۔

﴿۱۳﴾۔۔۔ اس مقام پر ممکن ہے کہ کوئی سوچے کہ چوتھی آیت کریمہ کا نزول محض اسلئے ہوا تھا کہ حضرت زینب نے تفاخر بالنسب کیا تھا اور رسول اللہ ﷺ کو امتثال امر خداوندی میں اس تفاخر بالنسب کو دور کرنا مقصود تھا۔ لہذا آپ نے حضرت زینب کو حضرت زید کا پیغام دیا۔ انھوں نے انکار کر دیا، پھر یہ آیت نازل ہوئی۔ اسکے جواب میں عرض کروں گا:

﴿اولاً﴾۔۔۔ نہ تو یہاں تفاخر بالنسب کا سوال تھا اور نہ اس پر یہ آیت کریمہ کا نزول ہوا۔ سوال تو صرف اتنا تھا کہ گو بر بنائے مسئلہ کفایت حضرت زینب انکار کر سکتی تھیں، لیکن پیغام نبوی کے بعد انکو اپنے حق شرعی کے استعمال کرنے میں کوئی مضائقہ ہے یا نہیں! اسکا جواب قرآن کریم نے عطا فرمایا۔

﴿ثانیاً﴾۔۔۔ اگر کسی کو بر طبق مسئلہ کفایت حق شرعی حاصل ہو اور وہ اپنے حق شرعی کو استعمال کرے تو تفاخر بالنسب ہو جائے تو ایسا حق دینا ہی تفاخر بالنسب کی بنیاد رکھنا ہے، نہ کہ اس کو دور کرنا ہے۔ لہذا تحقیق امر وہی ہے جسکو میں نے اس جواب کے شق اول میں بیان کر دیا۔

﴿۱۴﴾۔۔۔ حکم الہی کو فرض کہنا اور حکم نبوی کو واجب کہنا، حکم نبوی کی اہمیت کو

نوٹ: اس حاشیہ کے تحت حضرت نے جو کچھ تحریر فرمایا اسے 'تحریم اور فلسفہ تحریم' کا عنوان دے کر ایک علیحدہ مقالے کی شکل دے دی گئی ہے، جو اسی کتاب کے صفحہ نمبر ۷۹ پر موجود ہے۔

﴿۱۶﴾۔۔۔ 'حدیث اذخر' میں اسکی خاص عبارت کی وجہ سے بہت سے امور قابل غور ہیں:

﴿۱﴾۔۔۔ 'الا الا ذخر' کوئی مستقل جملہ نہیں اور حضرت عباس کے عرض کرنے سے پہلے جو کچھ آنحضرت فرما رہے تھے، اسکا تعلق اسی سے ہے۔ رہ گیا رسول کریم کا سکوت، یہ محض درمیان کلام میں حضرت عباس کی عرض کی طرف متوجہ ہونے کی وجہ سے تھا۔ اسی لئے اذخر اگر بدل ہے تو 'مرفوع' ہے اور اگر 'استثناء بعد النفی' ہے تو 'منصوب' ہے۔

﴿۲﴾۔۔۔ کلام سابق جس میں ممانعت کا حکم تھا ابھی اسکی تعمیل صورت ہونے نہ پائی تھی کہ 'الا الا ذخر' نے حق اذخر میں اس کو 'منسوخ' فرما دیا تو کیا قبل تعمیل حکم اس کا 'نسخ' جائز ہے یا نہیں؟

﴿۳﴾۔۔۔ 'مستثنیٰ منہ' اور 'استثناء' کے درمیان سکوت واقع ہوا تھا تو اب یہ 'استثناء' کلام سابق سے متصل ہے یا منفصل۔ پھر اگر متصل ہے تو اسکا کیا نتیجہ ہے اور منفصل ہے تو اس کا کیا نتیجہ ہے؟ اس میں ائمہ اصول کا بڑا اختلاف ہے۔

﴿۴﴾۔۔۔ کیا حکم 'منزل من اللہ' محض حرمت قتال ہی کیلئے تھا اور باقی امور آنحضرت خود فرما رہے تھے، یا یہ کہ جو کچھ فرمایا گیا تھا، سب وحی کے ذریعہ سے آیا تھا؟

﴿۵﴾۔۔۔ حضرت عباس نے یہ درخواست کی تھی کہ اذخر کو مستثنیٰ کر دیجئے،

یا بطور تلقین کے عرض کر دیا تھا؟

﴿۶﴾۔۔۔ آنحضرت نے یہ استثناء محض حضرت عباس کی درخواست پر فرمایا، یا یہ کہ وہ درخواست کرتے یا نہ کرتے، بہر حال آنحضرت 'الا الا ذخر' فرما ہی دیتے؟

﴿۷﴾۔۔۔ برطبق مسئلہ تفویض شارع ﷺ استثناء فرمائیں تو اس کیلئے کلام مستقل کی ضرورت ہے یا اس کو حکم الہی سے متصل قرار دیا جاسکتا ہے؟
(ماخوذ از فتح الباری)

ان ہی مباحث و اختلافات کثیرہ کی وجہ سے شارحین حدیث نے اس حدیث خاص میں مختلف احتمالات نکالے ہیں۔۔۔ یعنی میں ہے:

وَقَوْلُهُ ﷺ إِلَّا الذُّخْرُ يَجُوزُ أَنْ
أَوْحَى إِلَيْهِ تِلْكَ السَّاعَةِ أَوْ مِنْ اجْتِهَادِهِ ﷺ

۔۔۔ یعنی۔۔۔

ممکن ہے کہ اسی وقت وحی بھیج دی گئی ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ حکم اجتہادی ہو۔۔۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں:

'چوں المتاس کرد عباس استثنائے اذخرازا آنحضرت وحی آمد پس استثنا کرد و فرمود الا ذخر مگر اذخر کہ رواست قطع کردن و در مذہب بعضے آنست کہ احکام مفوض بود بوی ﷺ ہر چہ خواہد و برہر کہ خواہد حلال و حرام گرداند و بعضے گویند باجتهاد گفت و اول اصح و اظہر است'

۔۔۔ یعنی۔۔۔

جب حضرت عباس نے اذخر کے استثناء کیلئے درخواست پیش کی تو وحی آئی اور آپ نے 'الا الا ذخر' کہہ کے استثناء فرمادیا، بعض لوگوں کا مذہب ہے

کہ تفویض احکام کے اختیار سے حضور نے اس کو مستثنیٰ فرمایا اور بعض کہتے

ہیں کہ اجتہاد سے کیا۔ پہلا احتمال اصح و اظہر ہے۔

--- ان دونوں شرحوں سے چند باتیں معلوم ہوئیں:

﴿۱﴾ --- اجتہاد کا استعمال کبھی وحی کے مقابلہ میں ہوتا ہے، جیسا کہ علامہ عینی نے کیا اور کبھی تفویض کے مقابلہ میں ہوتا ہے، جیسا کہ شیخ نے کیا۔ پہلی صورت میں اجتہاد و تفویض میں معنی کوئی فرق نہیں، صرف اصطلاحاً اعتباری فرق ہو سکتا ہے۔ لیکن تعبیرات کے بدلنے سے حقیقت نہیں بدلتی، مال دونوں کا ایک ہی ہوگا۔ جو احکام بذریعہ وحی نہیں آئے، ان کو خواہ رسول کے اجتہاد سے تسلیم کیا جائے، یا تفویض احکام کے تحت رکھا جائے، بات ایک ہی ہوگی۔ دوسری صورت میں اجتہاد، تفویض سے کوئی الگ چیز ہے۔

﴿۲﴾ --- 'الا الا ذخر' کے وحی ہونے کا صرف احتمال ہے، کوئی یقینی امر نہیں۔

﴿۳﴾ --- تفویض احکام کے اختیار سے حضور نے یہ فرمایا ہے، اس کا صرف

احتمال ہی نہیں، بلکہ بعض علماء کا مذہب بھی ہے۔ لہذا اس کو کفر و شرک اور بدعت و گمراہی سمجھنا اسلاف کرام پر طعن و تشنیع ہی نہیں، بلکہ انکو کافر و مشرک اور بدعتی و گمراہ سمجھنا ہوا۔

﴿۴﴾ --- حضرت شیخ نے احتمال وحی کو اصح و اظہر فرما کر صرف احتمال تفویض

یا احتمال اجتہاد کیصحیت و اظہریت کی نفی کی ہے، یہ اس بات کو مستلزم نہیں کہ دوسرے احتمالات غلط ہوں۔۔۔ الغرض۔۔۔ حضرت شیخ کا کلام بھی احتمال وحی کے سوا دوسرے احتمالات کو غلط نہیں بتا رہا ہے، چہ جائیکہ شرک و کفر اور بدعت و گمراہی کہے۔

اب رہ گیا ان تمام مباحث و اختلافات پر نظر کر کے یہ قرار دینا کہ حضرت عباس کی عرض سے پہلے جو کچھ فرمایا جاتا تھا، وہ سب حکم الہی تھا، محض قتال کی خصوصیت نہ تھی اور حضرت عباس کی درخواست سے کوئی اثر نہیں پڑا۔ اس کی وجہ سے سکوت فرمانا

ایسا تھا جیسے کلام مستقل کے درمیان سانس لینے یا کسی اچانک وجہ سے سکوت کا وقفہ پیدا ہو جاتا ہے اور 'الا الا ذخر' حضور بہر حال فرمادیتے اور برطبق مسئلہ تفویض کلام مستقل بہتر ہے، اسکو اصح و اظہر فرمادینا شیخ محقق کی تحقیق میں بہتر تھا۔ لہذا فرمادیا کہ 'الا الا ذخر' بھی بذریعہ وحی آیا، یہی زیادہ ظاہر ہے۔

--- الحاصل --- خاص حدیث اذخر ہی میں اس کی خاص عبارت کی وجہ سے یہ احتمال وحی نکالا گیا ہے اور اس احتمال کو خاص اسی حدیث میں شیخ نے اصح و اظہر، فرمایا ہے، ایسا نہیں کہ وحی و تفویض اور اجتہاد میں مسلک وحی کو ہر جگہ اصح فرمایا ہو۔ کیونکہ شیخ تو خود مسئلہ تفویض کے قائل ہیں اور اس کو قول صحیح فرمانے والے ہیں۔ --- حدیث شریف میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت عقبہ ابن عامر رضی اللہ عنہ کی قربانی، شش ماہی بکری کی خاص انہی کیلئے جائز فرمادی تھی اور فرمادیا تھا کہ سوائے تمہارے کسی کیلئے ایسی قربانی کافی نہیں۔ (بخاری و مسلم)

--- اسی حدیث کے تحت حضرت شیخ فرماتے ہیں:

’کفایت آن مخصوص بہ عقبہ ابن عامر است چنانکہ در خدع مغز آمد آمدہ است کہ ذبح کن تو آن را و کفایت نمی کند از ہیچ یکے مگر از تودہ آنحضرت رامی رسد کہ تخصیص کند بعض احکام را بہ بعض اشخاص و احکام مفوض بود بویے بر قول صحیح۔‘ ﴿اشعة المعات، ج ۱﴾

--- دیکھئے، یہاں صاف فرمایا کہ تمام اقوال میں صحیح قول تفویض کا ہے اور بغیر اس کے کہ کسی کا قول بتائیں خود اپنا مسلک یوں بیان فرما رہے ہیں کہ:

’آنحضرت رامی رسد کہ تخصیص کند بعض احکام را بہ بعض اشخاص‘ اس پوری تفصیل کو سمجھ لینے کے بعد اب کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا نہ ہونا

چاہئے کہ جب اس حدیث زیر بحث میں دوسرے بھی احتمالات تھے تو پھر اسکو حضرت قبلہؑ کا ہی علیہ الرحمہ نے مسئلہ تفویض کے ثبوت کیلئے کیوں پیش کیا۔ اسلئے کہ اسکا جواب ظاہر ہو چکا کہ بعض ائمہ نے اس سے مسئلہ تفویض کو ثابت فرمایا ہے۔ پھر شیخ محقق قدس سرہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں بعض کے نزدیک استثناء بر بنائے مسئلہ تفویض ہے، تو جو قوم تفویض کو شرک، اور رسول کو خدا بنانا، کہتی ہو اسکے رد میں اس حدیث کو بھی پیش کرنا، بلکہ صرف اسی ایک حدیث کو پیش کرنا کافی ہے کہ حدیث میں جس جس بات کا احتمال نکلے کوئی بھی نہ شرک ہے، نہ بدعت، اور نہ رسول کو خدا بنانا ہے۔

﴿۱۷﴾۔۔۔ اگر حضور کو شریعت میں اختیار نہیں تو اس قسم کے احکام واجب العمل نہ ہونے چاہئیں۔

﴿۱۸﴾۔۔۔ اگر حضور کو شارع نہ مانا جائے تو فرض کو تقویت پہنچتی ہے، کیونکہ روافض یہی کہتے ہیں کہ چونکہ تقسیم میراث قرآن کریم سے ثابت ہے، اسلئے حضور کی تمام املاک کی مالکہ حضرت خاتونِ جنت ہوئیں۔ اسکے جواب میں یہی کہا جاتا ہے کہ چونکہ حدیث میں آگیا ہے کہ ہم کسی کے مَوْرَث نہیں اسلئے حضور اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔

﴿۱۹﴾۔۔۔ حدیث شریف میں ہے، مَنْ نَشَبَہَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ، جس نے کسی قوم سے تشبیہ کی وہ انہی میں سے ہے۔ اس حدیث شریف کے الفاظ ہی اس امر کی طرف مشیر ہیں جو بالقصد اپنے کو کسی قوم کے مشابہ کرتا ہے اس کا یہ حکم ہے۔ اور اگر مشابہت کا قصد و ارادہ نہ ہو تو محض مشابہ ہو جانے سے اس حکم میں داخل نہ ہوگا۔۔۔ یہ حقیقت تو بالکل واضح ہے کہ اپنے کو کسی کے مشابہ کرنا اور کسی کے مشابہ ہو جانا اور۔۔۔ یعنی تشبیہ ایک چیز ہے اور تشبیہ دوسری چیز، دونوں کا ایک حکم نہیں۔۔۔ مثلاً: اگر خدا کے وجود کو کوئی اسلئے تسلیم کرے کہ نصاریٰ و یہود اسکے قائل ہیں تو اس شخص کا حشر نصاریٰ و یہود کے ساتھ ہوگا اور اگر خدا کے وجود کو اسلئے مانے کہ یہ ایک حقیقت

ثابت ہے، جسکی تعلیم بارگاہ رسالت سے ملی ہے تو اس کا حشر مسلمانوں کے ساتھ ہوگا۔
اگرچہ وہ اس امر خاص میں نصاریٰ ویہود کے مشابہ ہے۔

﴿۲۰﴾۔۔۔ 'وغیرہا' سے ان آیات کریمہ کی طرف اشارہ ہے جن میں کسی خاص واقعہ یا حکم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے جلال و جبروت کا اظہار فرمایا ہے۔ مثلاً: ایک جگہ نبی کریم ﷺ اور انکے غلاموں کو حکم دیا گیا کہ مشرکین کیلئے دعائے مغفرت نہ کرنا۔۔۔ ایک موقع پر ارشاد فرمایا گیا کہ قیدیوں کو معاوضہ لے کر ان کو چھوڑ دینا نبی کو نہ چاہئے۔۔۔ ایک آیت کریمہ میں آیا کہ منافقوں اور کافروں کے جنازہ کی نماز کبھی نہ پڑھنا اور نہ ان کی قبر پر کھڑے ہونا وغیرہا۔۔۔ ان آیات کریمہ سے 'مسئلہ تقویض' پر اعتراض کرنے والوں کو ان آیات پر بھی نظر رکھنی چاہئے جن میں ان کلمات و اختیارات اور خصوصیات کا ذکر ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کو نوازا ہے اور وہ روش نہ اختیار کرنی چاہئے جو وافض نے صحابہ کرام کے متعلق اختیار کی ہے۔۔۔ شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی نے اس قسم کے استدلال کے متعلق کیا خوب مثال دی ہے:

’شخصے زلات انبیاء علیہم الصوات والصلوات از قرآن مجید التقاط نماید مثل
عَصَىٰ اٰدَمُ رَبَّہٗ فَغَوٰی و سوال حضرت نوح در حق پسر خود و کواکب
را پروردگار خود گفتن و بدروغ شکست بتاں را نسبت بضم بزرگ
کردن و خود را واقع بیمار و انمودن کہ از حضرت ابرہیم صدور یافتہ و قتل
قبطی از حضرت موسیٰ و کشیدن ریش حضرت ہارون کہ برادر کلاں و
پیغمبر بودند بے تامل و تحقیق کہ از حضرت موسیٰ نیز بوقوع آرد گناہ
حضرت داؤد و مقدمہ وزن اور یا و علی ہذا القیاس و گوید کہ در قرآن
مجید مطاعن و مثالب انبیاء بہ تواتر و قطعیت ثابت شدہ پس انہما مستحق
نبوت نبودند و الاثاں را نیک دانستن خلاف قرآن کردن است این

شخص بے تمیز اس قدر نہ فہمید یا فہمید و پردہ شفاوت بریدہ عقل
اوشنید۔ نصوص قبیحہ متواترہ بے شمار از قرآن در مدارج و بیان خو
بیہائے حال و قال ایں بزرگواراں و جا بجا ثنائے اسنہا واقع است
اگر در قصہ یا حکمے عتاب برایشاں برائے عبرت و یگراں کردہ باشند
وایشاں را تا دیب و ارشاد نمودہ باشند معارض و مناقض آن قطعیات
کثیرہ نمی تواند شد و لا بد از آن حملے است نیک کہ دور از مرتبہ ایشان کہ
بالقطع است نباشد۔ (تحدیث شاعر یہ، ص ۷۳، ۷۴، کید ہشتاد و ششم)

اُن آیات کریمہ سے جنگی طرف حضرت قبلہ گاہی نے اشارہ کیا ہے، مسئلہ
تفویض کی حقانیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اسلئے کہ جن آیات و احادیث میں اس مسئلہ کا
تذکرہ ہے، انھیں یا تو اللہ تعالیٰ پر افتراء قرار دیا جائے گا یا نہیں۔ اگر نہیں تو مسئلہ تفویض
ثابت۔ ورنہ قرآن وحدیث، بلفظ دیگر خدا و رسول مفتری ہو گئے نَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ
ایک مومن کسی حال میں بھی اس آخری معنی کا قائل نہیں ہو سکتا، لہذا اب کسی مومن کیلئے
سو اس کے چارہ کار نہیں کہ وہ مسئلہ تفویض کو حق سمجھ لے۔

حضور قبلہ گاہی نے لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ و غیر ہا کے متعلق ضروری ہدایتوں
کے تحت جو کچھ فرمایا ہے وہ اس آیت کریمہ و غیر ہا کو مسئلہ تفویض کی نفی کیلئے پیش کرنے
والوں کے جواب میں کافی ہے، لیکن اسی آیت مذکورہ کی تشریح کے متعلق چند میری
بھی گزارشات ہیں جن کو ملحوظ خاطر رکھنا بہت ہی مفید ہے۔۔۔

﴿۱﴾۔۔۔ آیت کریمہ میں لفظ مُحَرَّم اصطلاح فقہی پر نہیں، بلکہ واقعہ کو
دیکھتے ہوئے تحریم کے معنی امتناع کے ہوئے کہ اے حبیب! تم ازواج مطہرات کے
کہنے سے استعمال شہد سے کیوں باز رہو گے؟ تم کو ازواج کا خیال ہے اور مجھ کو تمہاری
خوشی کا۔ تم کو شہد پسند ہے، اس کو استعمال کرو۔۔۔ معلوم ہوا کہ اس آیت کریمہ میں

نبی کریم کی شانِ محبوبیت اور بارگاہِ الہی میں آپ کی رضا جوئی نمایاں ہوتی ہے۔۔۔ غور تو فرمائیے کہ رسول کریم نے نہ تو استعمالِ شہد کو اُمت کیلئے حرام فرمایا تھا اور نہ یہی فرمایا تھا کہ مجھ پر حرام ہے، بلکہ محض خود استعمال نہ فرمانے کو فرمایا تھا۔ اور ہر ایک کو یہ اختیار تیزی حاصل ہے کہ جس کو چاہے عمل میں لائے اور جس کو چاہے ترک کر دے۔۔۔ لیکن رحمتِ خداوندی نے یہ پسند نہ فرمایا کہ ہمارا پسندیدہ رسول، اپنی پسندیدہ چیز کو پسند رکھتے ہوئے بھی کسی غیر ضروری وجہ سے استعمال نہ فرمائے۔۔۔ الحاصل۔۔۔ اس آیت کریمہ کو مسئلہ تفویض کی نفی سے تو کوئی تعلق ہی نہیں، بلکہ یہ تو بارگاہِ محبت میں محبوب کی شان کو اجاگر کر رہی ہے۔

﴿۲﴾۔۔۔ لفظ **مُحَرَّم** کو اگر اصطلاح فقہی پر رکھا جائے تو اس آیت کریمہ کے معنی یہ ہونگے: 'اے رسول تم نے کیوں حرام کر لیا ہے اس چیز کو جسے اللہ نے تمہارے لئے حلال کر دیا ہے'۔

۔۔۔ اس صورت میں بھی ہمارے مطلوب پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اسلئے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول کریم نے استعمالِ شہد کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔ ارب صورت حال، دو دو حال سے خالی نہیں ہو سکتی۔ یا تو رسول کریم کے حرام فرمانے سے وہ چیز حرام ہو گئی تھی یا نہیں۔ اگر حرام ہو گئی تھی تو مسئلہ تفویض ثابت اور اگر حرام نہیں ہوئی تھی تو پھر **لَمْ يُحَرَّم** کہہ کر تحریم نبوی کی تنسیخ کی ضرورت ہی کیا ہے؟

۔۔۔ الحاصل۔۔۔ اگر **لَمْ يُحَرَّم** کے لفظ ہی پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ **لَمْ يُحَرَّم** فرمانا، مسئلہ تفویض کی حقانیت مبنی ہے پ

اس مسئلہ پر یوں بھی غور کیا جاسکتا ہے کہ تحلیلِ الہی کی تحریم اور تحریمِ الہی کی تحلیل، تشریحی اختیارات رکھنے والے کے ماسوا سے بالاتفاق کفر ہے اور قرآن نے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ رسول کریم نے تحلیلِ الہی کی تحریم کی ہے جو اس امر کی واضح دلیل

ہے کہ رسول کو منجانب اللہ تشریحی اختیارات حاصل ہیں اور مسئلہ تفویض حق ہے۔

﴿۳﴾۔۔۔ مسئلہ تفویض کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے کہ اپنے اور اپنے نبی کے جس حکم کو چاہے مسترد فرما دے اور اگر مسترد نہ فرمائے تو پھر حکم نبوی واجب التعمیل ہے اور وہ بھی حق امت میں کہ امت اس کی پابندی کرے۔ لہذا اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ استعمال شہد کو حضور نے حرام ہی فرما دیا تھا تو کیا حق امت میں حرام فرمایا تھا؟ اور اگر یہ بھی سہی تو پھر آیہ کریمہ میں اتنا ہی تو ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو مسترد فرما دیا، اس میں حرج ہی کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ جس حکم نبوی کو چاہے مسترد فرما سکتا ہے، خود اپنا حکم بھی منسوخ فرما دیا ہے، تو کیا حکم منسوخ، قبل نسخ، واجب التعمیل نہ تھا! اور جب تھا تو کیا حکم نبوی مسترد فرمانے کے پہلے واجب التعمیل نہ ہوگا اور جب ہوگا تو 'مسئلہ تفویض' کے خلاف اس قسم کی آیتوں سے کیا اثر پڑا؟ بلکہ ان آیات سے 'مسئلہ تفویض' کی مزید تائید ہوتی ہے کہ اگر حکم نبوی حق امت میں واجب التعمیل نہیں ہے تو پھر اسکے استرداد و نسخ کی حاجت ہی کیا ہے اور نسخ کتاب بالسنة بلکہ نسخ سنة بالکتاب کی اصولی بحث ہی بے کار ہوئی جاتی ہے۔

انتباہ۔۔۔ یہی تقریر ان آیات کریمہ میں بھی جاری ہے جن میں 'منع استغفار' و 'عدم رہائی اسیران کفار' و 'عدم جواز نماز جنازہ کفار' کا تذکرہ ہے۔۔۔۔۔ یہ خیال رہے کہ جن آیات کریمہ میں شریعت کے، شریعت الہیہ ہونے کا ذکر ہے اور اس کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے، وہ آیات کریمہ 'مسئلہ تفویض' کی نفی نہیں کرتیں۔ اسلئے کہ 'مسئلہ تفویض' بھی شریعت الہیہ ہی کا ایک مسئلہ ہے۔

﴿۲۱﴾۔۔۔ مثلاً:

﴿۱﴾۔۔۔ حضور ﷺ کا علم بچوں، پاگلوں، جانوروں کی طرح یا انکے برابر ہے۔
(حفظ الایمان، مصنفہ مولوی اشرف علی تھانوی)

سوال ۱:۔۔۔۔۔ حدیثوں میں ہے کہ ایک صحابی نے ’توریت‘ کا مسئلہ دریافت فرمایا تو حضور نے ’آیت میراث‘ کے نزول سے پہلے جواب عطا نہ فرمایا۔ ایک صحابی نے ’لعان‘ کا مسئلہ دریافت کیا تو حضور نے وحی آسمانی کا انتظار فرمایا اور نزول وحی کیلئے دعا فرمائی۔ حضور ﷺ کی مرضی تھی کہ رخ بہ کعبہ نماز پڑھیں، مگر آپ نے ’آیہ تجویل قبلہ‘ کے نزول سے پہلے رخ بہ کعبہ نماز ادا نہ فرمائی۔ ایک صحابی نے ’ظہار‘ کا مسئلہ دریافت کیا تو حضور نے فرمایا کہ جیسا مجھ کو حکم آئے گا بتا دوں گا۔ لہذا آپ علیہ السلام شارب نہ تھے اور نہ مسئلہ تقویض ہی حق ہے۔

جواب ا:-۔۔۔۔۔ شارع الطریق کے شارع ہونے اور مسئلہ تفویض کے صحیح ہونے کیلئے یہ ضروری نہیں ہے کہ شریعت منجانب اللہ نہ رہے اور اللہ تعالیٰ حکم فرمانے سے باطل و معطل ہو جائے۔ جہاں تک مسئلہ تفویض کا تعلق ہے، اس کا صحیح و حق ہونا اس پر موقوف ہے کہ تمام شریعت کو منجانب اللہ ہونا مان لیا جائے۔ کیونکہ تفویض کا مطلب یہ ہے کہ شارع الطریق کو حق ہے کہ جس کو چاہیں، جس حکم سے چاہیں، خاص فرمادیں۔ جس قانون سے چاہیں مستثنیٰ فرمادیں۔ تو جب تک کوئی عام نہ ہوگا، تخصیص کسی چیز کی ہوگی، جب تک مستثنیٰ منہ نہ ہوگا، استثناء کس چیز سے کیا جائے گا۔ اسی

تخصیص و استثناء کے اختیار کو 'مسئلہ تفویض' کہتے ہیں اور تفویض ہی کا تقاضہ ہے کہ شریعت کے نزول کا انتظار کیا جائے۔ تو انتظار کرنا اور جلد آنے کیلئے التجا کرنا مسئلہ تفویض کی حقانیت کیلئے مضر نہیں۔ غور تو کیجئے کہ اگر نبی کریم نے 'آیہ میراث' کا انتظار فرمایا تو اس کے نزول کے بعد اگر وہ انبیاء کو مستثنیٰ بھی فرمادیا، تو کیا استثناء فرمانا انتظار کے منافی ہو گیا۔ اسی طرح اگر حضور اکرم نے 'آیہ تحویل قبلہ' کے نزول کا انتظار فرمایا تو بعد نزول وہ کیا جس کو 'تحفہ' میں فرمایا کہ 'حالت سفر و سواری ازیں مستثنیٰ است بروایات پیغمبر ﷺ'۔ آخر شارع اللہ کا حالت سواری و سفر کو مستثنیٰ فرمادینا کس حق کی بنا پر ہے؟

سوال ۲:۔۔۔ اگر اس قسم کا اختیار نبی کریم کو ہوتا تو پھر نماز شب معراج میں ابتداء پچاس وقت کی فرض ہوئی تھی، اس کو بار بار التجا کر کے پانچ وقت کی نماز کیوں کرائی؟ خود ہی جس قدر چاہتے کم کر دیتے؟

جواب ۲:۔۔۔ اس سوال میں معقولیت اس وقت ہوتی جب کہ کسی با اختیار کو، اس سے جس کا اس با اختیار پر بھی اختیار اعلیٰ ہے، بلکہ اختیار اعلیٰ والے ہی نے اس کو با اختیار بنایا ہے، التجا کرنا با اختیار کے با اختیار ہونے کے منافی ہوتا۔ اور جب ایسا نہیں، جیسا کہ ظاہر ہے، تو یہ وجہ بھی معقول نہیں۔۔۔ غور تو فرمائیے کہ ہر نائب السلطنت کو قانوناً آرڈیننس (ordinance) نافذ کرنے کا اختیار ہوتا ہے، با اس ہمہ وہ اپنی مرکزی کابینہ سے مشورہ کرتا ہے اور وقت کے مقتضاء کے مطابق اپنا طرز عمل قائم کرنے کی اجازت لیتا ہے۔ لیکن باوجود اس کے وہ با اختیار ہی رہتا ہے۔۔۔ البتہ اگر واقعہ معراج سے یہ نتیجہ نکالا جائے تو اس کے انکار کی گنجائش نہیں کہ جس رسول کی شفاعت و التجا نے پچاس وقت کی نماز کو تمام امت پر پانچ وقت کی نماز کر دیا، اسی کی رحمت و رافت کے اقتضاء نے صرف پانچ کو دو کر دیا۔ کیونکہ جب

اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ زمین تک پہنچتے پہنچتے پانچ وقت کی نماز رہ جائے گی تو پچاس فرض فرمانا اور اس کو بواسطہ نبی پانچ کر دینا، ظاہری طور پر نبی کو مدخلت فی الدین کا حق دینا اور اپنی طرف سے امر شریعت میں رضا جوئی حبیب کو ملحوظ رکھنا ہے۔ اب اگر کسی ایک ہی شخص کی خاطر رضائے حبیب دو نمازوں کیلئے ہو جائے تو امر الہی کے اس کے مواقف ہونے میں کیا مانع ہے؟ فرق صرف اس قدر ہے کہ پچاس کو پانچ کرنے کیلئے ارشاد الہی بذریعہ وحی متلو بھی ہو گیا اور پانچ کو دو کرنے میں ارشاد الہی بذریعہ تفویض احکام ہوا۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ پچاس وقت کی نماز کا مشروع ہونا محض روایت ہی روایت ہے اور جو حکم شرع اس پر پہنچا وہ پانچ وقت کی نماز کا تھا۔ اب اسی پانچ وقت میں مسئلہ تفویض کا حق پیدا ہوتا ہے کہ اس کو دو فرما دیا گیا۔ اگر پانچ وقت تک ہونے میں واقعات مرویہ پیش نہ ہوتے تو پھر حق تفویض کس میں پیدا ہوتا؟ لہذا ان واقعات سے مسئلہ تفویض کی حقانیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

سوال ۳:۔۔۔ قرآن کریم مذکور ہے کہ اقامت دین اور تفرقہ سے بچنے کیلئے حضرت عیسیٰ و حضرت موسیٰ اور حضرت نوح اور خود رسول کریم کو اللہ تعالیٰ نے وصیت فرمائی ہے اور سب کیلئے ایک ہی اصول دین مشروع فرمائے، لہذا مسئلہ تفویض کا بطلان محتاج بیان نہیں۔

جواب ۳:۔۔۔ قرآن کریم کے ارشاد کا صاف مطلب یہ ہے کہ تمام ادیان سماویہ، اصول دین میں متحد ہیں اور جو ایک دوسرے سے جدا گانہ احکام و شرائع ہیں، وہ محض اعمال و فروع میں ہیں۔۔۔ اسکو مسئلہ تفویض کے انکار سے کیا واسطہ! اور پھر یہ استدلال اسکے مقابلہ میں جائز ہے جو کہہ رہا ہو کہ شریعت اسلامیہ اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔ لیکن جو یہ کہتا ہو کہ تمام و کمال شریعت اور اسکے جملہ مسائل یہاں تک

کہ مسئلہ تفویض بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے اور بغیر تمام شریعت کو شریعت الہیہ مانے ہوئے تفویض متصور ہی نہیں ہو سکتی، تو ایسے شخص کے سامنے مذکورہ استدلال پیش کرنا کتنی نادانی و بوالعجبی ہے!

سوال ۴:۔۔۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول کریم کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ تمام دینوں پر دین محمدی کو غلبہ دیدے، لہذا 'مسئلہ تفویض' غلط ہے۔

جواب ۴:۔۔۔ اس 'لہذا' کے ماقبل کو اسکے بعد سے کیا رشتہ ہے، اسے سائل ہی سمجھ سکتا ہے! مجھے تو صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو بھیجا اور ہدایت و دین حق کے ساتھ بھیجا اور اسی ہدایت و دین حق میں مسئلہ تفویض بھی ہے، تو ایسی صورت میں تفویض کا انکار ہدایت و دین حق کے بھی انکار کے مرادف ہے۔

سوال ۵:۔۔۔ قرآن کریم میں ایک جگہ ہے کہ پیدا فرمانا اور حکم دینا اللہ تعالیٰ ہی کیلئے ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ حکم نہیں ہے سوا اللہ تعالیٰ کیلئے، لہذا مسئلہ تفویض غلط ہے۔

جواب ۵:۔۔۔ اس استدلال کے متعلق ایک تاریخی واقعہ سننے کے قابل ہے کہ جب جنگ صفین میں مولائے کائنات نے حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت عمرو ابن العاص کا 'حکم' ہونا منظور فرمایا تھا تو خارجیوں نے حضور مولیٰ پر یہی زبان درازی کی تھی کہ چونکہ قرآن کریم میں ہے کہ **إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ**، حکم نہیں سوا اللہ کیلئے، لہذا 'حکم' بنا کر (معاذ اللہ) حضرت مولیٰ کافر ہو گئے۔ مولائے کائنات نے اسکا مختصر سا جواب عطا فرمایا۔۔۔ **كَلِمَةُ حَقٍّ أُرِيدَ بِهَا الْبَاطِلُ**۔۔۔ یعنی۔۔۔ آئیہ کریمہ تو حق ہے، مگر جس مقصد کیلئے اسے پیش کیا گیا ہے وہ باطل ہے۔ یہ واقعہ جہاں ایک درس آموز حقیقت ہے وہیں سوال مذکور کا جواب بھی ہے۔۔۔ قرآن کریم نے بھی بہت سارے مقامات پر غیر خدا کی حاکمیت کی طرف اشارہ بلکہ تصریح کی ہے۔۔۔ مثلاً:

الف:۔۔۔ فَاَبْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهِ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا

ایک 'حکم' مرد کی طرف سے اور ایک عورت کی طرف سے بھیجو۔

ب:۔۔۔ يٰۤاٰدَا۟رَآءُ جَعَلْنَاكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ

ج:۔۔۔ دَا۟وُدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِى الْحَرْثِ

۔۔۔ یہ دونوں آیتیں حضرت داؤد و حضرت سلیمان کو حاکم بنا رہی ہیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ حکم ذاتی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کیلئے نہیں اور حاکم حقیقی اس پاک پروردگار کے سوا دوسرا کوئی نہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ 'مسئلہ تحکیم' اسی اللہ تعالیٰ کی شریعت کا مسئلہ ہے، اسی کے حکم سے اسکے بندے یا ہمی معاملات میں بحیثیت حاکم حکم دیتے ہیں۔ اسی طرح 'مسئلہ تفویض' بھی اسی کے حکم سے ہے۔ تفویض کا لفظ بتاتا ہے کہ یہ منجانب اللہ ہے۔۔۔ اور جو لوگ اس بات پر بہت مصر ہیں کہ غیر خدا کو حاکم نہیں کہہ سکتے، ورنہ شرک ہو جائیگا۔ ان سے صرف اتنا کہنا ہے کہ وہ صرف اپنے حکام ضلع ہی کو لکھ کر بھیج دیں کہ جناب والا کو حاکم کہنا شرک ہے، تو ہم سمجھیں کہ وہ اپنے رنگ کے پختہ ہیں اور جو دل سے گڑھ لیا ہے، اس پر جیسے ہوئے ہیں۔ لیکن ایسوں کے بل بوتے اور زور بازو کو ہم جانتے ہیں کہ حکام کو ایسا لکھنا تو درکنار، ان کو حاکم کہنا بھی نہیں چھوڑ سکتے۔ لہذا اب آیہ کریمہ کے صحر کی وجہ خود ہی بتائیں!

سوال ۶:۔۔۔ قرآن کریم میں ہے نبی کریم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، اپنے

رب کے پیغاموں کو تمام و کمال پہنچانے والے ہیں، اپنی امت کے خیر خواہ اور امین ہیں۔ اور دوسری جگہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔ اور تیسری جگہ ہے کہ نبی کریم صرف رسول ہیں اور رسول کے معنی قاصد کے ہوتے ہیں، لہذا مسئلہ تفویض غلط ہے۔

جواب ۶:۔۔۔ اس سوال کا منشاء کچھ ایسا نظر آ رہا ہے کہ مسائل کے نزدیک رسالت کسی منصب خاص اور قرب یا اختصاص کا نام نہیں ہے بلکہ رسول محض قاصد کو کہتے ہیں۔ جو پوزیشن ایک چٹھی رساں اور نامہ بر کی ہوتی ہے وہی رسول کا حال ہے۔ چٹھی رساں کا کام یہ ہے کہ چٹھی دے اور چلا جائے، نہ اس کو کوئی سلام کرے، نہ تعظیم، نہ اس سے کچھ بات چیت کرے، نہ اسکے عمل کی پیروی۔ اسی طرح نہ رسول فرماں روا ہے، نہ مطاع اور نہ کسی تعظیم کے لائق ہے۔ شریعت لا کر دیدی اب مسائل کو اس سے کیا واسطہ! معاذ اللہ۔۔۔ کاش! مسائل اسی بات پر غور کر لیتا کہ ایک چٹھی رساں کو بھی کم سے کم یہ اختیار ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ نہ ملے تو خط واپس کر دے، خط پیرنگ ہو تو مکتوب الیہ سے پیسے وصول کر لے، وغیرہ۔ اور اگر قاصد ایسا ہو جسکے بارے میں بھیجنے والے نے لکھ دیا ہو کہ یہ قاصد ایسا ہے کہ اسکی خوشی میری خوشی ہے، اسکی اطاعت میری اطاعت ہے، اس کا حکم میرا حکم ہے۔ میرے احکام کو بیان کرنا اور اس کی شرح کرنا اس کا حق ہے۔ اگر یہ قاصد کسی بات میں مراعات برتے تو اس کو اس کا بھی حق حاصل ہے۔۔۔ اس اعلان و تشریح کے بعد اگر وہ قاصد اپنے اختیارات کو استعمال کرے تو کیا مسائل کے نزدیک وہ قاصد اب بھی قاصد محض ہی ہے؟۔۔۔ بیشک ’مَا فَهِمْتُ إِلَّا رَسُولًا‘ کی روشنی میں ہمارے سرکار صرف رسول ہیں، لیکن آپ کی ’رسالت عامہ‘ کا وہ مقام ہے جہاں سے ’عرش اعظم‘ کی منزل بھی نیچے نظر آتی ہے۔ اگر مسائل اس حقیقت کو سمجھ لیتا تو اسکو اپنے سوال کا جواب مل جاتا۔

سوال ۷:۔۔۔ اسلام دین سماوی ہے، لہذا اسکے سارے احکام سماوی ہونے چاہئیں۔ تو اگر مسئلہ تفویض کو حق مان لیا جائے تو اسلام دین سماوی نہ رہے گا اور اس کے بعض احکام غیر سماوی ہوں گے۔

جواب ۷:۔۔۔ ہمیں اسلام کے دین سماوی اور شریعت الہیہ ہونے سے

انکار نہیں۔ لیکن یہ معلوم ہونا چاہئے کہ 'تفویض احکام بشارع اللہ' کی بناء بھی ہے کہ شریعت اسلامیہ شرع الہی اور دین سماوی ہی ہے۔۔۔ نبی کریم کا ہر امر، ہر نہی، ہر ایجاب، ہر نفی، ہر استثناء اور جو کچھ بھی ہے 'شرع الہی، باذن الہی' ہے۔

غور فرمائیے ہزاروں مسائل ہیں، جن میں کسی معاملہ خاص میں قضاء قاضی کے بعد وہ حکم اس معاملہ کیلئے عند اللہ متیقن مانا جاتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ شریعت اسلامیہ دین الہی نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دین الہی میں حسب شریعت الہیہ قضاء قاضی بھی داخل ہے۔ تو پھر 'تفویض احکام بشارع اللہ' کا یہ مطلب کیسے ہو گیا کہ شریعت اسلامیہ دین آسمانی نہیں ہے! بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ 'تفویض'، شریعت اسلامیہ کی تقدیم چاہتی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ قضاء قاضی کی بنا پر اس دین کو دین قاضی نہیں کہہ سکتے لیکن دین الہی کو دین محمدی اور شریعت کو شریعت محمدیہ بالضرورة کہہ سکتے ہیں، بلکہ کہتے رہتے ہیں۔ نیز یہی اطلاق ظاہر کرتا ہے کہ 'فضیلت تفویض' حق ہے، کیونکہ بر بنائے اجتہاد اگر دین و شریعت کی نسبت کسی کی طرف جائز ہوتی تو پھر مذہب حنفی کو دین حنفی اور شریعت حنفیہ کہنا جائز ہوتا۔ اسی طرح اگر بر بنائے تبلیغ یہ نسبت جائز ہوتی تو شریعت کی نسبت تمام علمائے مبلغین کی طرف صحیح قرار پاتی، لیکن کسی کی طرف دین و شریعت کی نسبت نہ ہونا اور دین محمدی و شریعت محمدیہ کہنا جائز اور شائع ہونا خود ایک مستقل دلیل ہے کہ یہ نسبت اسی فضیلت پر مبنی ہے جس کو 'تفویض احکام بشارع اللہ' کہتے ہیں اور اسی بناء پر نبی اللہ کے سوا مجتہد یا مبلغ کو شارع نہیں کہا جاتا۔ غرض اس دین اسلامی اور شریعت الہیہ کا آسمانی، بھی مسئلہ تفویض کیلئے ضروری ہے اور اس کی حقانیت کی دلیل ہے۔

باسمہ تعالیٰ

ماخذ

شرح وحاشیہ نگاری کے سلسلے میں جن کتابوں سے براہ راست استفادہ کیا گیا ہے ان کی فہرست یہ ہے:

- (۱) قرآن کریم
- (۲) بخاری شریف امیر المومنین فی الحدیث امام ابو عبد اللہ محمد ابن اسماعیل بخاری
- (۳) مسلم شریف امیر المومنین فی الحدیث امام ابوالحسن مسلم بن الحجاج نیشاپوری
- (۴) ابوداؤد شریف امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث سجستانی
- (۵) ترمذی شریف امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی
- (۶) مسند امام احمد امام ابو عبد اللہ احمد بن محمد بن حنبل
- (۷) مشکوٰۃ شریف امام شیخ ولی الدین محمد بن عبد اللہ خطیب عمری
- (۸) فتح الباری امام علامہ ابوالفضل بن حجر عسقلانی
- (۹) اشعۃ اللمعات محقق علی الاطلاق شیخ عبدالحق بن سیف الدین محدث دہلوی
- (۱۰) تقریب البہذیب علامہ ابوالفضل احمد بن علی المعروف بابن حجر
- (۱۱) تفسیر بیضاوی علامہ قاضی ناصر الدین ابوالخیر عبد اللہ بن عمر الدیہاوی
- (۱۲) تفسیر روح البیان فاضل کامل شیخ اسماعیل حقی آفندی

- (۱۳) تفسیر مدارک امام جلیل علامہ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد بن محمود نسفی
- (۱۴) تفسیر جلالین علامہ جلال الدین سیوطی و علامہ جلال الدین محلی
- (۱۵) الصواعق المحرقة علامہ شہاب الدین احمد ابن حجر المہندی
- (۱۶) نور الانوار علامہ شیخ احمد المعروف بہ ملا جیون جون پوری
- (۱۷) تحفۃ اثنا عشریہ حضرت علامہ شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی
- (۱۸) البیان الساطع فی تشریح الشارح حضرت مولانا محمد الیاس ظفر آبادی غازی پوری
- (۱۹) جاء الحق وزهق الباطل حضرت مولانا مفتی احمد یار خان صاحب
- (۲۰) حسام الحرمین مرتبہ للمجدد الماسی الخاضعہ الامام احمد رضا
- (۲۱) الصوارم الہندیہ شیر بیشہ البست حضرت مولانا حشمت علی خان
- (۲۲) حفظ الایمان مولوی اشرف علی صاحب تھانوی
- (۲۳) براہین قاطعہ مولوی خلیل احمد صاحب انیسٹھوی
- (۲۴) تحذیر الناس مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی

جن کتابوں سے بالواسطہ فائدہ حاصل کیا گیا ہے وہ یہ ہیں:

- (۱) عینی شرح بخاری علامہ بدر الدین عینی
- (۲) خلاصہ تہذیب الکمال
- (۳) ابن جریج
- (۴) دیلمی
- (۵) انموذج اللیب علامہ جلال الدین سیوطی
- (۶) تفسیرات احمدیہ علامہ شیخ احمد المعروف بہ ملا جیون جون پوری

- (۷) جواهر التفاسیر علامہ محمد عبدالحکیم لکھنوی
- (۸) تنویر المقیاس من مرتبہ صاحب قاموس علامہ محمد الدین شیرازی
- (۹) تفسیر خازن علامہ علاء الدین علی بن محمد بن ابراہیم بغدادی معروف بہ خازن
- (۱۰) تفسیر درمنثور علامہ جلال الدین سیوطی
- (۱۱) عقیل
- (۱۲) الصارم المسلمول لابن تیمیہ



تصدیق نامہ

میں نے گلوبل اسلامک مشن، آنک، نیویارک، یو ایس اے کی کتاب، نام

مقالات شیخ الاسلام

کی طباعت کے وقت اسکے ہر صفحہ کو حرفاً بحرفاً بغور پڑھا ہے۔

تصدیق کی جاتی ہے کہ اس میں موجود قرآن کریم کی آیات کریمہ اور احادیث شریفہ کے الفاظ اور اعراب دونوں بالکل صحیح ہیں۔ اور میرا یہ سرٹیفکیٹ درستگی اور غلط سے پاک ہونے کا ہے۔ دوران طباعت اگر کوئی زیر، زیر، پیش، جزم، تشدید یا نقطہ چھپائی میں خراب ہو جائے تو اسکا متن کتابت کی صحت سے تعلق نہیں ہے۔۔۔۔۔ علاوہ ازیں۔۔۔۔۔ کتاب ہذا میں کوئی مضمون ملک و ملت کے خلاف نہیں ہے۔

فقط

المصدق

الذی علیہ

Syed Mohd. Azmat Ali Noor
Research & Registration Officer
Sind, Pakistan

سید محمد عظمت علی نوری

ریسرچ و رجسٹریشن آفیسر

(محکمہ اوقاف، سندھ) کراچی



مطبعة دار الفکر، کراچی

گلوبل اسلامک مشن، آنک
نیویارک، یو ایس اے

معارف القرآن

اردو ترجمہ قرآن



مترجم: مخدوم الملت ابوالمجد حضور سید محمد محدث اعظم ہند
آسان، بہترین اور انوکھا ترجمہ قرآن جسکے بارے میں اعلیٰ حضرت
احمد رضا خان صاحب بریلوی رحمہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ”شہزادے تم نے اردو میں قرآن لکھا ہے۔۔۔“



سید الشہداء المعذوف بہ

تفسیر اشرفی

﴿التھا۔ سیتول ۲۔ تلافالول ۲﴾



چالیس احادیث
مبارک کی حقیقت
مفصل شرح

الامیر العبدین الاشرفی

وفد ایم الخیش البتبول

شیخ الاسلام والمسلمین

حقیقت علانہ مجرم مدنی فی شیخی خیالی



Visit Our Website :-

WWW.ASHRAFTTIMES.COM

From :-

Mohaddis-E-Azam Mission
Surat Branch

1/1674, Habibshah Street, Nanpura, Surat, Gujarat, 395001

WWW.ASHRAFTTIMES.COM